

جاسوسی دنیا

جلد نمبر 7

شاہی نقارہ 21

خون کا دریا 22

قاتل سنگریزے 23

ابن صفائی

اسرار پبلی کیشنر

اکرمیم مارکیٹ، مین کبیر سٹریٹ

جملہ حقوق محفوظ

اس ناول کے نام ، مقام ، کردار اور کہانی سے
تعلق رکھنے والے اداروں کے نام فرضی ہیں۔

پبلیشر خالد سلطان

پرنٹر ہاشم انٹر پرائز

سیل ڈپو: عثمان ٹریڈرز

الکریم مارکیٹ، مین کبیر سڑیک

اردو بازار لاہور۔ فون : 7321970

جاسوسی دنیا نمبر 21

شاہی نقارہ

(مکمل ناول)

پیش رس

”شاہی نقارہ“ ملاحظہ فرمائے۔

کچھ دن ہوئے ایک دوست نے کہا تھا کہ پیش رس میں کتاب کے بارے میں لکھتے کی
بجائے اس صفحے پر ”قسمت“ کا خال بتایا کرو۔ کتاب کی اشاعت بھی بڑھ جائے گی۔ میں نے
کہا مجھے یہ ”وقیا“ نہیں آتی۔ کہنے لگے ذہانت کو کام میں لاو۔ میں نے کہا نہیں بھائی! میرے
بس کاروگ نہیں ہے۔ بولے ”اچھا میں تمہاری رہنمائی کرتا ہوں۔ اعلان کرو کہ اس
کتاب پر نظر پڑتے ہی سب سے پہلے جس جانور کا خیال آئے اس کا نام، اپنے نام اور پتے
کے ساتھ ہمیں لکھ بیجھے۔ ہم آپ کی آئندہ زندگی کے سارے احوال بتادیں
گے۔“

میں حیرت سے ان کی شکل دیکھتا رہا۔ میری دشواری سمجھ کر زور سے ٹنے اور بولے
”میاں ہر شخص آئندہ زندگی سے متعلق طرح طرح کے نہوائی قلعے بناتا رہتا ہے۔
تمہارے بھی کچھ ہوائی قلعے ضرور ہوں گے۔ ان ہی پر نظر رکھتے ہوئے اچھی اچھی پیش
گویاں کرتے چلے جانا۔ بس ایک ٹھنڈیکی لکھتے سمجھ لو۔ وہ یہ کہ کسی کو پانی سے محتاط رہنے کی
ہدایت کر دینا اور کسی کو آگ سے۔ کراچی کا باشندہ ہو تو صرف ایک ہی ہدایت کرنا کہ
پیدل سڑک پار کرنے کی جرأت کبھی نہ کرے۔ اس طرح تمہاری غیب دانی کی بھی دھاک
بینھ جائے گی اور صفحہ بھی بھر جائے گا۔“

آپ کی کیارائے ہے؟

والسلام

ابن صفحہ

کنواری ہرنی

مئی چار بجے سے بارہ بجے تک کی دوڑدھوپ کے بعد بکشکل تمام ایک ہرنی ساتھ گلی تھی اور اب وہ اسے اویز نے میں مشغول ہو گئے تھے۔ نوکروں نے لکڑیوں کے ذیمر میں آگ لگادی اور وہ جلد سے جلد اسے اویز کر آگ میں ڈال دینا چاہتے تھے۔ لیکن اس معاملے میں سب کے سب اہازی تھے۔ کسی ذبح کے ہوئے جانور پر سے کھال اللہ کرنا آسان کام نہیں ہے اور پھر اسی صورت میں اور زیادہ دشواری آپریتی ہے جب کھال کو صحیح و سلامت اتنا نے کام سلے درپیش ہو، سرجنت حمید نے جو سارا اہتمام دیکھا تو اس کی جان ہی نکل گئی۔ حالانکہ اس نے صح کو بواگہرا ناشستہ کیا تھا۔ مگر جگل کی دوڑدھوپ میں اس کی افادیت دو گھنٹے سے زیادہ قائم نہ رہ سکی تھی اور تقریباً دو گھنٹے سے اس کی آنسیں غالب کا "حیران ہوں دل گور روؤں کہ پیوں جگر کو میں" والا شعر یاد کرنے کی کوشش میں مشغول تھیں۔ ان تین دنوں میں کوئی ایسا لمحہ نہیں گزرا تھا جس میں اس نے جھوک کی شکایت کی ہو۔ شکار میں یوں بھی تھوڑی بہت تکلیف ہوتی ہے لیکن جب فریدی جیسے آدمیوں کا ساتھ ہو تو یہ تھوڑی بہت تکلیف مصیبوں کا پہلا ہن کر سامنے آ جاتی ہے۔ شکار کے سلسلے میں اس کا مقولہ تھا کہ شکار کا مطلب روز مرہ زندگی میں تبدیلی پیدا کرنا ہے۔ لہذا اگر شکار میں بھی آرام و آسائش برقرار رہے تو پھر فرق ہی کیا پڑتا ہے۔ اگر شکار میں بھی پکا پکایا کھانا سامنے آ گیا تو پھر جیسے گھردیے شکار گاہ۔ یہی وجہ تھی کہ اس نے کھانے پینے کی چیزوں میں کافی، چائے، شکر، دودھ کے ڈبے اور کچھ دوسرے لوازمات کے علاوہ کسی اور چیز کی اجازت نہیں دی تھی۔ صرف حمید اپنے ساتھ مجھلیوں کے دو تین ڈبے چھا کر لایا تھا جس میں سے وہ صرف ایک

ہی استعمال کر پایا تھا کہ فریدی کی نظر پر گئی اور اس نے بقیہ کو دریا برد کر دیا اور حمید نے اپنا سر پیٹ لینے کا ارادہ بھی متوجہ کر دیا تھا۔ کیونکہ اس میں بھی سراسر اپنا ہی نقصان تھا۔

شکاریوں کی پارٹی آنہ دس آدمیوں پر مشتمل تھی جن میں کچھ فریدی کے دوست تھے اور ان کے علاوہ دو تین توکر۔ وہ اپنے ساتھ دو تین چھوٹی چھوٹی چھولہ اریاں لائے تھے جن کے نیچے رات بسر کی جاتی تھی ورنہ دن بھر تو سر پر کھلا ہوا آسمان ہوتا تھا۔ چونکہ بارش کا زمانہ تھا اس نے دھوپ تو شاذ و نادر ہوتی تھی لیکن کبھی بھی ہوا تبدیل ہو جاتی اور اتنا شدید جس ہو جاتا کہ انہیں اپنی قمیش سک اتار سکتی پڑتی اور یہ سمجھتے کہ اب موسلاطہ بارش شروع ہو جائے گی۔ مگر جب تھوڑی سی بوندا باندی کے بعد بادل پھنسنے لگتے تو ان کی جان میں جان آتی وہ لوگ دراصل آبادی سے تقریباً پدرہ میل کے فاصلے پر پڑتے ہوئے تھے۔ اگرچہ موسلاطہ بارش شروع ہو جاتی تو کہیں پناہ ملنی مشکل تھی۔ بھلا کیوں اس کی چھولہ اریاں کب تک بارش کا بار سنبھال سکتیں۔

آج بھی صبح ہی سے بارش کے آثار تھے۔ لیکن چھپتے تجربات کی بنا پر وہ اس کی طرف سے کچھ مطمئن سے ہو گئے تھے۔ ان میں صرف حمید ہی ایک ایسا تھا جس نے کبھی اس مسئلے پر توجہ نہیں دی تھی۔ اس کا زیادہ تر وقت تو یہ سوچتے میں صرف ہوتا تھا کہ اگر اتفاق سے شکار نہ ملا تو کیا ہو گا۔ پرندے بھی نہ ملے تو رات کیوں کر گزے گی۔ کیا صرف کافی یا چاۓ پی پی کر بھوک بھلانی جاسکتی ہے؟ اسے فریدی کے ساتھ شکار میں اکثر بڑے تیز تجربات ہوئے تھے۔ اس کا ایک خط حمید کو تیری طرح کھلتا تھا۔ وہ یہ کہ وہ بھیش پرندوں یا جانوروں کو ہوشیار کر دینے کے بعد ان پر گولی چلاتا تھا۔ لہذا اکثر ایسا بھی ہوتا کہ دن بھر جنک مارنے کے باوجود وہ ایک پرندہ بھی شکار نہ کر سکتے اور پھر وہ کی رو شیاں چائے یا کافی میں ڈبو ڈبو کر کھائی جاتی۔ آج بھی وہ کہی پرندے شکار کر لیتے لیکن فریدی کی چدت طرازیوں سے ناکام رہے اس نے دو تاں بندوق سنبل رکھی تھی۔ پہلے وہ ایک ہوائی فائر کر کے پرندوں کو اڑا دیتا پھر ان پر فائر کرتا۔ اتفاق سے آج اس کی ساری کوششیں رایگاں گئی تھیں۔ اگر اشرف نے ایک ہر دن نہ مار لیا ہوتا تو پھر چائے اور خلک روشنوں کی نوبت آ جاتی۔

حمد جانتا تھا کہ فریدی کے ساتھ رہ کر تفریح بھی زحمت بن جاتی ہے اس لئے وہ احتیاطاً چھلیوں کے شکار کا سامان بھی ساتھ لیتا آیا تھا۔ مگر اسے بد قسمتی ہی کہنا چاہئے گہ اس علاقے میں

اسے ایک بھی ایسا تالا بیا پوکھر نہ مل سکا جہاں وہ مجھیں پھنسا سکتا۔ قریب ہی ایک ندی تھی جو کسی تیز رفتار ندی میں اول تو مجھیں لگتی تھی نہیں اور اگر اتفاق سے ایک آدھ گئی بھی تو وہ اکثر اپنے ساتھ ڈور اور چٹی بھی لے جاتی ہے۔ حمید نے دو تین بار اس ندی میں شکار کھیلنے کی کوشش کی تھی لیکن ایک کاشا اور ایک بُجھی کھودنے کے بعد بیتھے پر اسے کافی رحم آیا اور اس نے اس کا خیال ہی ترک کر دیا۔

اس وقت بھی وہ مجھیوں ہی کے متعلق سوچ رہا تھا اور اس کے ساتھی ہرن کی کھال اتارنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فریدی ایک درخت کے تنے سے نیک لگائے بیٹھا اپنی رانقل کا معائنہ کر رہا تھا۔ حمید سوچنے لگا کہ کھال اتارنے کے بعد اس کے گلزارے کے جائیں گے اور اس میں تقریباً ایک گھنٹہ ضرور لگے گا۔ دھنٹا اس کو ایک تدبیر سوچ گئی۔

”اڑے بھائی صاحب کیا تم لوگوں کے عقل پر پھر پڑ گئے ہیں۔“ وہ بیٹھنے بیٹھنے ہنکارا۔

”کیوں؟“ اشرف بھنویں تان کر بولا۔

”دیکھتے نہیں ہو کہ یہ مادہ ہے۔“

”تو پھر...!“

”اور اس کے تھنوں سے صاف ظاہر ہے کہ اس نے ایک بار بھی بچے نہیں دیئے۔“

حمد نے محققانہ انداز میں کہا۔

”کیا کہنا چاہتے ہو۔“ شاہد بولا۔

”فور آپسیت چاک کر دواں کا۔“

”چند ہیں آپ اچھے خاصے۔“ اشرف نے کہا اور پھر کھال اتارنے میں مشغول ہو گیا۔

”میں کہتا ہوں نادرت تمہارے فرشتے بھی اس کا گوشت نہ کھائیں گے۔“

”کیوں...!“

”اگر کبھی کاپتے پھٹ گیا تو سارا گوشت کڑوا ہو جائے گا۔“

”پتے کیسے پھٹ جائے گا۔“ ساجد نے کہا۔

”ڈکاری کی دم بنے ہیں۔“ حمید منہ بگاڑ کر بولا۔ ”بھی اور بھی شکار کھیلا تھا۔ میاں صاحب

زادے کتواری ہرنی کو ذبح کرتے کے بعد فوراً ہی اس کی بیٹھی باہر نہیں نکال لی جاتی تو پتے خود بخود

پھٹ جاتا ہے۔ ”

فریدی کچھ بولنا ہی چاہتا تھا کہ حمید نے اُسے آنکھ مار دی۔

”تو پھر....!“ فیم نے پوچھا۔

”پیٹ چاک کر کے لیکنی نکال پھینکو۔“ حمید نے کہا۔

”کھال نہ خراب ہو جائے گی۔“ شاہد نے پوچھا۔

”پھر وہی ذیوت پن کی باتیں۔ کیوں کیا پانی بھرنے کا منگلیزہ بناؤ گے؟“

”نہیں تو....!“

”پھر پیٹ چاک کر دینے میں کیا مصیبت ہے۔“

فریدی پہلے تو حمید کو گھورتا رہا پھر چکے سے انھ کر کھک کیا۔

”نہیں کھال خراب ہو جائے گی۔“ اشرف نے کہا۔

”پھر وہی اندازیوں جیسی باتیں۔“ حمید انھتہ ہوا بولا۔

”نہیں نہیں یار کیا کر رہے ہو۔“ اشرف نے کہا۔

لیکن حمید نے اس کے ہاتھ سے چھری لے کر ہرنی کا پیٹ چاک کر دیا۔

”ٹھہر د.... ٹھہر د۔“ اس نے اس کے پیٹ میں ہاتھ ڈال کر اس کی آنتیں کھینچتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے زخمی کاٹ کر لیکنی کی واڑ باہر نکال لی اور اسے ہاتھ میں لٹکا کر کھڑا ہو گیا۔

”کیوں....؟“ فیم نے اسے سوالیہ انداز میں کہا۔

”اے پھینک آؤں....؟“ حمید نے کہا۔

”گھاس تو نہیں کھا گئے ہو۔“ اشرف بھنا کر بولا۔

”یار اندازیوں سے خدا ہی بچائے! اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ اس سے پہلے کبھی تمہیں ہر قوں غیرہ کا شکار کھیلنے کا اتفاق نہیں ہوا تو ساتھ لانے پر کبھی رضا مند نہ ہوتا۔“

”کیا بک رہے ہو۔“

”اڑے یہ کنواری ہرنی کی لیکنی ہے۔“ حمید نے دانت پیس کر کہا۔

”تو پھر....!“

”پہلے بخار آئے گا اور پھر کوڑھ تک ہو جانے کے امکانات ہو سکتے ہیں اور اگر بالکل ہی

کنواری ہر فی ہوئی تو اس سے بھی بدتر حالت ہو سکتی ہے۔“

”ہم نے تو کبھی نہیں سن۔“ فیم نے کہا۔

”تم نے یہ بھی نہ سنا ہو گا کہ ہر فی بھی کنواری ہوتی ہے۔“

”کیوں فضول بکتے ہو۔“

”آخر تھیں کس طرح یقین دلاؤں۔“ حمید نے بظاہر زیچ ہو کر کہا۔

”فریدی سے پوچھیں گے۔“ ساجد بولا۔

مگر فریدی پہلے ہی جھک گیا تھا۔ اس نے حمید کی نیت بھانپ لی تھی۔ لہذا وہ نہ تو حمید کی طرف سے نہ اپنا چاہتا تھا اور نہ دوسرا دوستوں کی طرف سے۔

”آپ جائیں جنم میں۔“ حمید نے جھک کر کہا ”اگر ایک آدھ بار بیمار پڑ گیا تو کہاں لا دے پھریں گے۔“

وہ تیزی سے چلتا ہوا چھولدار بیوں کے چیچے آیا اور بیہاں جوتے اتار کر بیوں کے مل جو دوڑ لگائی تو سر کنڈوں کی کھائیوں ہی میں آکر دم لیا۔

پھر اس نے جلدی جلدی خٹک لکھیاں چینیں اور ان میں آگ لگا کر بیکھی کی ڈالا اس پر رکھنے والے جارہاتھا کہ ایک چیل نے کسی طرف سے جھپٹا مارا اور بیکھی کی ڈالا اس کے ہاتھ سے صاف نکال لے گئی۔ حمید کے منہ سے بے اختیار ایک موٹی سی گالی بٹکی اور وہ اس کے چیچے دوڑ۔

سیر ڈیڑھ سیر کا وزن چیل کے بس کاروگ نہیں گا۔ تھوڑی ہی دور جانے کے بعد بیکھی کی ڈالا اس کے بیوں سے چھپت پڑی اور حمید شکاری کتے کی طرح اس کی طرف جھپٹا لیکن اس بار اس کی امیدوں پر باقاعدہ طور پر اس پڑ گئی۔ بیکھی کی ڈالا کسی چوپائے کے تازہ کے ہوئے گوبر میں لختزی پڑی تھی۔

چیل سامنے ہی ایک درخت پر بیکھی شاید اس مال غیرمت پر دوبارہ بقشہ کرنے کے امکانات پر غور کر رہی تھی۔

حمید نے بھنا کر ایک بڑا پتھر اٹھایا ہی تھا کہ کسی نے اس کے کانہ سے پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ چوک کر پلانا اور پھر اسے فریدی کی طنز آمیز مسکراہٹ کا سامنا کرنا پڑا جو اس کے خون کی حدت اور زیادہ بڑھادیا کرتی تھی۔

فریدی نے اس کی طرف را تقلیل بڑھائی۔

”کیا ہے....!“ حمید جملہ کر بولا۔

”پرندوں پر پتھر چلاتا ظلم ہے۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”پتھر تو صرف ان بچوں پر چلاتے جاتے ہیں جو کسی سمجھیدہ بزرگ کے پیچے تالیں بجانے پلتے ہیں۔“

”آپ چاہئے کیا ہیں۔“ حمید نے گز کر کہا۔

”تمہیں سمجھا بجا کرو اپس لے جانا۔... کیا تم نے بچپن میں نانی والی سے نہیں سن کہ چیل کو ملنے سے کافیوں میں درد ہوتا ہے۔“

”خدا کی قسم....!“

”کوئی اٹھی سیدھی بات نہ کہہ بیٹھنا۔“ فریدی اس کی بات کاٹ کر بولا۔

”او، چیز شابش....!“

”نہیں جاؤں گا۔“

”اچھا گی....!“ فریدی نے اس کی گردان پکڑ لی۔ ”دھو کے باز! مکار.... ان بے چاروں کو آلو بنا کر پیچی لے اڑے تھے۔ فرزند من! کنواری ہرنی کی پیچی کوئی شادی شدہ چیل ہی ہضم کر سکتی ہے۔“

گردان تو چھوڑ دیئے۔ حمید نے جسم جنملا کر اس کا ساتھ جھٹک دیا۔

”شامت منڈلارہی ہے، تمہارے سر پر۔“

”شامت نہیں موت کہئے۔“ حمید نے جملہ کر کہا۔ ”آپ کے ساتھ تفریح بھی عذاب بن جاتی ہے۔“

”آگے بڑھو.... آگے۔“ فریدی اسے دھکا دیتا ہوا بولا۔ ”ابھی تو وہاں تمہاری بنے گی۔“

”خدا کی قسم کہئے گا نہیں کسی سے۔“ حمید نے پلٹ کر کہا۔

”کیوں؟“

”اب بتاؤں کیوں.... کیوں.... کیوں....!“ حمید جسم جنملا ہست میں تقریباً ناچھا ہوا بولا۔ ”چلتے ہو.... یا ایک کندہ رسید کروں۔“ فریدی نے را تقلیل کی تالی پکڑ کر کندہ اٹھاتے ہوئے کہا۔ اوہ راشرف نے اپنی انگلی کاٹ لی تھی اور چھری پھینک پھانک کر الگ جا کھڑا ہوا تھا۔ فریدی اور حمید کو آتے دیکھ کر اس نے کنواری ہرنی کی پیچی کا تذکرہ چھیڑ دیا۔

"بھی مجھے ہر نوں کے متعلق زیادہ معلومات نہیں۔" فریدی نے کہا۔

"لیکن یہ کیا؟ کیا انگلیاں کاٹ لیں۔ یاد تم لوگوں سے ایک ہر فنی کی کھال نہیں اوچیری باتی۔"

اچھا بھی حید! بھی جانتے ہیں کہ تمہارے ہاتھ لگے بغیر کوئی کام ٹھیک نہیں ہونگا۔"

حید نے فریدی کو گھر کر دیکھا اور پھر ہر فنی پر ثبوت پڑا۔

"ارے کھال...! اشرف چینا۔

"ہات تمہاری کھال کی ایسی تیسی۔" حید چین کر بولا۔ "یہاں بھوک کے مارے حال پتا ہے اور آپ کو کھال کی پڑی ہے۔"

دیکھتے ہی دیکھتے اس نے کھال کے پرچے اڑا دیئے اور کئی جگہ سے کھال کے ساتھ گوشت بھی اوچیر ڈالا۔ جب کھال الگ ہو گئی تو ایک نو کر بولا۔

"حضور کھال کھینچنے کا یہ طریقہ نہیں ہے۔"

"میں... تواب نک... کہاں مرے ہوئے تھے آپ۔"

"چچلی نامگوں کی کھال نکالنے کے بعد اسے انا اخا کر کھال کھینچ لی جاتی ہے۔"

"بس دفان ہو جاؤ۔" حید جھلا کر بولا۔ "ورنہ میں یہی سلوک تمہارے ساتھ کروں گا۔"

"ارے صاحب آپ لوگ خود ہی تو بھڑ گئے تھے ورنہ ہم لوگ ساتھ کس لئے آئے ہیں۔"

نوکرنے کہا۔

"اچھا تواب اس کے نکلوے کرو۔" حید دانت پیتا ہوا بولا۔ "ورنہ تھوڑی دیر بعد آکر کہو گے کہ نکلوے کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے ہر کو اپنے اوپر سوار کرنے کا موقع بندا جائے۔" حید چھری پھینک کر الگ ہٹ گیا۔

تحوڑی دیر بعد نوکروں نے ہر فنی کے نکلوے کردیئے اور انہیں نمک لگا کر جو ناجانے لگا۔

حید بے چینی سے اپنی جگہ پر پہلو بدلتا رہا تھا۔

"یاد تمہاری بھوک بھی قیامت ہے۔" اشرف بولا۔

"میں تمہاری طرح مر یعنی تو ہوں نہیں۔" حید نے منہ بنا کر کہا۔

بھوک تو قریب قریب بھی کو لگ رہی تھی۔ اس لئے بات زیادہ نہیں بڑھنے پائی۔

جب وہ لوگ کھانے کے لئے بیٹھے تو اور اور کی باتیں چھڑ گئیں۔ فریدی انہیں اپنے

اگلینڈ کے تجربات تاریخ تھا۔ اس سلسلے میں اس نے اسکات لینڈ یارڈ سے لے کر ایسٹ انڈیا کے گرفتار چینی خانوں تک کے حالات تھائے۔

”اور جناب نے کیا سمجھا۔“ فیض نے حمید کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”بوسر لینے کے پیچا سخت طریقے۔“ حمید اپنے ہاتھ میں دبی ہوئی ہندی کو نہایت انہماں

سے چھوڑتا ہوا بولا۔

یہ بات اس نے اتنی سمجھی گی سے کہی تھی کہ فریدی بھی اپنی ہندی نہ روک سکا۔ لیکن حمید اس

ہری طرح اس ہندی سے بھڑا ہوا تھا کہ اس نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

”اور یہ کہ اگر...!“ وہ منہ چلا تا ہوا بولا۔ ”اگلینڈ میں کسی لڑکی کے سر پر پنجہ مریم کی پتیاں رکھ کر اس کا بوسر لے لو تو وہ قطعی برائی نہیں مانتی۔“

”کیا کواس ہے۔“ فریدی منہ بنا کر بولا۔

”تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔“

”تو پھر گواچوں تمہاری ماقیتیں۔“ فریدی نے کہا۔

”غپ اور حقیقت میں فرق ہوتا ہے۔“

”اچھا...!“ فریدی اسے گھوڑا ہوا بولا۔ ”تو کیا یہ غپ ہے کہ ایک ناٹ کلب میں ایک

عورت نے...!“

فریدی نے بات پوری نہیں کی تھی کہ حمید نے ایک زوردار قبیلہ لگایا اور اشرف کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ذر آپ کا حلیہ ملاحظہ فرمائیے۔“

”ہاں تو کیا ہوا تھا۔“ اشرف نے حمید کی بات اڑا کر فریدی سے پوچھا۔

”ہوا یہ کہ اس بد تیزی سے نہ کھاؤ کہ دوسروں کو قت ہو جائے۔“ حمید نے کہا۔

”ہمارے ڈان ٹروان حمید صاحب نے... ایک عورت کو مدد عو کیا۔“

”فیض! یار تم نہ ہوئے۔“ حمید نے پھر بیچھی سے بات اڑا دی۔ ”کتنا شامد ارتباں ہوا ہے

فریدی صاحب کا کہ داہوں۔ اسکات لینڈ یارڈ کے آفسر تو گویا بیچھے جادہ ہے تھے۔“

”اور وہ عورت نہیں میں ہری طرح دھت تھی۔“ فریدی نے کہا۔

”یہ دھت کیا بلا ہے۔“ حمید نے پھر ہاتھ پیر ملا۔ ”وھت دھت... دھت....“

ہلہلہ۔"

"میٹے حمید خاں نے اسے اور پلاڈی۔" فریدی رومال سے ہاتھ صاف کر کے سگار سلاکتا ہوا بولا۔
"اور کھائیے نا۔" حمید نے جلدی سے کہا۔ "بس اتنا ہی۔"

"اور جب اسے بہت زیادہ چڑھ گئی تو...!"

حمد نے پھر ہلا مچا کر اسے آگے نہ کہنے دیا۔

"یار تم سب اور کھاؤ... ابھی اور کھاؤ... کھاؤتا... ارے اشرف تم بھی کھا چکے ہو۔"

"تو پھر اس نے....!"

اب حمید نے باقاعدہ طلق چھاڑ کر چیننا شروع کر دیا۔ اس کے خاموش ہوتے ہی فریدی پھر بولا۔

"تو پھر اس نے حمید کا گریبان پکڑ لیا۔"

"گریبان پکڑ لیا۔" اشرف نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں گاڑی بان پکڑ لیا اور اپنے گھر چلی گئی۔" حمید نے جلدی سے کہا۔ "کیا شاندار غب
ہے.... کیا کہنا۔"

"اوہ پھر وہ...!"

"کیا آپ خواہ تنوہ...?" حمید بھنا کر بولا۔

"کیوں بچ میں ناگ اڑاتے ہو۔" اشرف نے کہا۔

"تم کیوں کو در ہے ہو۔" حمید اس پر پلٹ پڑا۔

اور پھر دونوں میں باقاعدہ ہکھرا شروع ہو گئی اور فریدی انھ کر ایک چھولداری کے احمد رضا گیا۔

بدقت تمام بقیہ لوگوں نے بچ بچاؤ کرایا۔

"تو اس سے کیا ہوتا ہے بات مجھے ہی معلوم ہو جائے گی۔" اشرف نے کہا۔

"یار تم خود ہی کیوں نہیں بتا دیتے۔" شاہد نے حمید سے کہا۔

روایتی کتاب

اور پھر سب کے سب حمید کی جان کو آگئے۔

"یار کیوں خواہ تکواہ بھیجا چاٹ رہے ہو تم لوگ۔" حمید زخم ہو کر بولا۔

پھر جی جی کر فریدی کو آوازیں دینے لگا۔

"بھی کوئی خاص بات نہیں۔" فریدی نے چولداری سے نکال کر کہا۔ "اس عورت نے حمید سے شلوٹی کی درخواست کی تھی۔"

"لا حول ولا قوہ۔" اشرف نے اسامنہ بناؤ کر بولا۔ "تو اس پر اتنی اچھل کو دیکھوں میں مچار ہے تھے۔

نہیں کوئی اور بات معلوم ہوتی ہے۔"

فریدی نے کوئی جواب دیئے بغیر پھر انہاں سر اندر کھینچ لیا۔

"جتاب والا...!" حمید دانت پیس کر بولا۔ "یقیناً کوئی اور بات ہے اور آپ اس بات کو سننے

کی تاب نہ لاسکیں گے۔"

انہوں نے پھر اسے ٹھک کر ناشروع کر دیا۔

"اچھا تو سنو....!" حمید بھنا کر بولا۔ "تم اس عورت سے بھی بدتر معلوم ہوتے ہو۔ جاؤ بابا

میرا چیچا چھوڑو۔ تم سب بھی میرے باپ ہو۔"

چولداری میں فریدی کے قیفیتی کی آواز سنائی دی اور وہ باہر نکل آیا۔

"وہ سالی تو خیر نشے میں تھی.... مگر یہ.... کم بخت۔"

"خیر بھی سنو....!" فریدی سگار کا کاش لے کر بولا۔

"بھی بس آرام کچھے۔" حمید نے جلا کر کہا۔ "میں خود....!"

اس نے بات پوری بھی نہیں کی تھی کہ یک بیک بڑی بوondیں پڑنی شروع ہو گئیں اور وہ سب بے ساخت چولداریوں کی طرف بھاگ گے۔ تقریباً پانچ منٹ ٹھک بہت تیزی سے بوondیں گرتی رہیں پھر دھوپ نکل آئی اور سب سے پہلے حمید نے بوکھلا کر اپنی قیفیں اتار چکی۔ ہوا قطعی بند ہو گئی تھی۔ بیکیل ہوتی زمین سے انجرات نکلتے معلوم ہو رہے تھے۔ مٹی کی سوندھی خوشبو اس جس میں اچھی لگنے کے بجائے گراں گزر رہی تھی۔

آہستہ آہستہ سب نے اپنی قیفیں اتار چکنکیں اور چولداریوں سے باہر نکل آئے۔ آسمان

پر ابر کے ٹکلوے موجود تھے اس لئے کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں۔ باہر بھی انہیں سکون نہ ملا اور وہ

پھر چولداریوں میں آگئے اور تھوڑی دیر بعد پہتھرے مگر چھوٹوں کی طرح اونٹنے لگے۔ نہ جانے

وہ کب تک سوتے رہے اور جب آنکھیں کھلی تو سب سے پہلے انہیں بارش کا شور سنائی دیا۔ یا شاید اسی شور ہی کی وجہ سے وہ جاگ پڑے تھے۔

موسلاط حار بارش ہو رہی تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پانی کا ریلا چھولہ اریوں میں در آیا۔ انہوں نے جلدی جلدی زمین سے بتر اٹھا کر واٹر پروف تھیلوں میں بھرنے شروع کر دیے۔

"یہ تو بہنے والا ہی معلوم ہوتا ہے۔" فریدی نے پر تشویش انداز میں کہا۔

"مگر مجھے تو یہ لہو باٹھے والا ہی جان پڑتا ہے۔" حمید نے منہ سکوڑ کر کہا۔ وہ اپنے جو تے اتار کر کیوناں کے تھیلے میں ڈال رہا تھا۔ پھر اس نے پتلوں کے پامیختے موڑ کر پنڈلیوں تک چڑھا لئے۔ آہستہ آہستہ چھولہ اریاں بھی پٹکنے لگیں۔

"اب کیا ہو گا۔۔۔؟" کسی نے کہا۔

پھر وہ فریدی کی تجویز پر اس انسٹیشن ویکن کی طرف بھاگے جس پر وہ سماں سمیت یہاں تک پہنچے تھے۔ اندر کھس کر انہوں نے کھڑکیوں کے شیشے گراوے اور چپ چاپ بیٹھے گئے۔ نوکروں اور دیہاتی رہبر نے ایک کھنی شاخوں والے بر گد کے درخت کے نیچے نیا نیا ہل۔ "سارا مزہ کر کر ہو گیا۔" اشرف بولا۔

"تیرت ہے کہ تم لوگ بے سر و سامانی سے لطف انداز نہیں ہوتے۔"

فریدی سگار لگاتا ہوا بولا۔ "لف تو اس وقت آتا جب یہ موڑ بھی نہ ہوتی۔"

"تو بسم اللہ!" حمید اٹھتا ہوا بولا۔ "راستہ یہ ہے۔ باہر تشریف لے جائیے۔ لطف ہی لطف بکھرا پڑا ہے۔"

وہ سب بھیں پڑے اور فریدی کھڑکی کے باہر دیکھنے لگا۔

"ایسے ہی موقعوں پر صحیح معنوں میں زندگی کا احساس ہوتا ہے۔" فریدی نے مژکر حمید کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

حمد پھر بھنا کر بولا۔ "مجھے یاد پڑتا ہے کہ پچھلی برسات میں ایک مینڈک نے بھی مجھ سے سیکی کہا تھا۔"

"ضرور کہا ہو گا۔۔۔ راز کی باتیں اپنوں ہی سے کہی جاتی ہیں۔" فریدی نے سکرا کر کہا۔

اس پر پھر ایک قپقہ پڑا اور حمید نے اسامنہ بناؤ کر دوسرا طرف دیکھنے لگا۔

بارش ہمنے کے آثار نظر نہیں آتے تھے اور اندر ہمراحتاکہ پھیلتا ہی جا رہا تھا۔ سات نجع پکے تھے۔ حوزی دیر چمک وہ خاموش رہے پھر دھنٹا حمید نے کہا۔ ”کیا مصیبت ہے۔ کیا ساری رات اسی طرح گزر جائے گی۔ اگر شروع ہی میں چل پڑے ہوتے تو اس وقت ہم کسی گاؤں ہی میں پناہ لے سکتے تھے۔“

”بھی تو مجھے کیا معلوم تھا کہ اس طرح بارش ہو گی۔“ فریدی نے کہا۔ حمید نے کوئی جلی کنی کہنے کے لئے منہ بٹایا ہی تھا کہ نوکر دوڑتے ہوئے اشیش و گین کی طرف آئے۔

”صاحب! ندی بڑھ رہی ہے۔“ دیہاتی راہبر پانچتا ہوا بولا۔

”یا...!“ فریدی چمک کر بولا۔

”تھی بہاں! تھوڑی دیر بعد بیہاں قدم جماناد شوار ہو جائے گا۔“

”تب تو بھی اکھڑا چھولداریاں۔“

”میں تو ہرگز نہیں جاؤں گا۔“ حمید پھیل گیا۔

”کیا سکتے ہو۔“ فریدی جھلا کر بولا۔

”والہ زندگی کا لطف اخنانے کا موقع پہلی بار نصیب ہوا ہے۔ میں اسے ہاتھ سے نہیں جانے دوں گا۔“

فریدی کچھ اور کہے بغیر و گین سے اتر گیا اور چھولداریاں اکھڑانے میں نوکروں کا ہاتھ ٹانے لگا۔ اس کی دیکھا دیکھی حمید کے علاوہ سب اتر آئے اور وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا پاسپ پیارا بھی ہوئی چھولداریاں و گین میں رکھی جانے لگیں۔ حمید نے ایک طرف پٹنا چاہا لیکن فریدی کے اشارے پر ایک چھولداری اس پر پھینک دی دی گئی۔ وہ بے اختیار چیخ کر سامنے والی سیٹ پر جا گرا۔ بوی خیریت یہ ہوئی کہ اس چھولداری میں کسی فوکرنے ہاتھ نہیں لگا کہ حمید اس کی بونیاں نوج لیتا۔ پھر بھی اسکے من سے بے تحاش ایسے الفاظ نکلنے لگے جن کا کوئی معنوں نہیں تھا۔

”کیا فضول ناہیں ناہیں لگا رکھی ہے۔“ فریدی نے اسے ڈالا۔

”جہنم میں... گ...!“

”ش اپ...!“

"خبر کبھی دیکھوں گا...؟" حمید بے بُی سے بولا۔

"اس تفریح میں تمہارا بھی حصہ تھا۔" فریدی نے کہا اور ڈرائیور کی سیٹ پر بینجھ گیا۔ تو کر بھی اندر آگئے اور دیہاتی راہ ہبہ فریدی کے برائے بینجھ گیا۔ ویکن چل پڑی۔

اس دوران میں یوندوں کا زور کم بھی ہوا اور پہلے سے زیادہ بھی لیکن تار نہیں ٹوٹا۔ چاروں طرف گہری تاریکی پھیل گئی تھی۔ فریدی را ہبہ کے ہتائے ہوئے راستوں پر ویکن کو لئے جا رہا تھا۔ لیکن دو ایک جگہ اس کی چلکپاٹ پر اسے محسوس ہوا کہ شاید وہ غلط راستے پر جا رہے ہیں۔

"بھی تم بھولتے تو نہیں۔" فریدی نے اس سے پوچھا۔

"نہیں صاحب۔" اس کے لمحے میں اعتقاد تھا۔

"خدا کرے تم بھولتی رہتے ہو۔" حمید دانت پر دانت جما کر بولا۔

لیکن وہ سب کچھ اس طرح بد حواس تھے کہ انہوں نے حمید کی بات کا نوٹس ہی نہیں لیا۔ وہ بھی کچھ نہ کچھ سوچ رہے تھے اور تھوڑی دیر بعد یہ بات ان پر اچھی طرح واضح ہو گئی کہ راہ تاتے والا خود ہی بھٹک گیا ہے۔ اس آندھی اور طوفان میں اس کے امکانات پہلے ہی سے موجود تھے۔ شکارگاہ میں آتے وقت وہ ندی کے کنارے آئے تھے، لیکن واپسی میں یہ چیز قطعی ہا ممکن تھی کیونکہ ندی کا پاٹ کافی بڑھ گیا تھا۔ وہ پہلے سے ایک تیز بہنے والی ندی تھی اور اس وقت تو اس کا پانی دور دور تک پھیل رہا تھا۔

دفعتاً فریدی نے گازی روک دی۔ ہیڈ لاٹیس کی روشنی میں صدقہ بھک پانی ہی پانی دکھائی دے رہا تھا۔

"کیوں بھی کیوں؟" کسی نے کہا۔

"آگے نال معلوم ہوتا ہے کیا آواز نہیں سن رہے ہو۔" فریدی نے کہا۔ "ابس صورت میں آگے بڑھنا بھی خطرناک ہے۔"

"اور پچھے بٹنے میں بھی اللہ میاں کا دیدار نصیب ہو سکتا ہے۔" حمید نے سمجھ گی سے کہا۔ "بس داپنے یا باپس سے نکل چلے۔ اللہ نے چاہا تو یہ اکھو کھر اپا رہے۔"

"شٹ اپ...!"

حمدی نے قبچہ لگایا اور سب کو اس کی بے وقت کی شہنمائی کھلنے لگی۔

فریدی نے ویکن گھمائی ہی تھی کہ دفعتا دیہاتی راہبر نے رکنے کے لئے کہا۔
ہبند لا نیشن کی روشنی میں دور ایک عمارت ہی دکھائی دی۔

”شاید ہم یہ دراج مگر کے قریب پہنچ گئے ہیں۔“ راہبر نے کہا۔ ”لیکن نالہ۔ یہاں واقعی
ایک نالہ پڑتا ہے۔“

”نالہ کس قسم کا ہے؟“ فریدی نے پوچھا۔

”معمولی سا۔“ راہبر نے کہا۔ ”ہم بآسانی اسے پار کر سکیں گے۔“

”کہیں پڑنا بھی مل سکے گی۔“ اشرف نے پوچھا۔

”کیوں نہیں! تواب صاحب بہت اچھے آدمی ہیں۔“

”کون تواب صاحب۔“ فریدی نے پوچھا۔

”تواب صولت مراد، یہ دraj مگر کے جاگیردار۔“

”اب کہاں جاگیردار ہیں۔“ قیم منہ بنا کر بولا۔

”نہ ہوں گے۔“ راہبر نے کہا۔ ”مگر اب بھی پورا قصبہ انہیں کے ہاتھ میں ہے اور کچھ اسی
قصبے پر منحصر نہیں۔ قرب دیوار کا سارا اعلاقہ اب تک ان کی مشی میں ہے۔“

”ہوگا بھی ہو گا۔“ فریدی کھڑکی کھول کر نیچے اترتا ہوا بولا۔ یہاں پانی خنوں سے اوپرناہ تھا۔
اس نے اندر سے اپنی رانچل انھائی اور اس کے کندھے سے زمین مٹوتا ہوا ہبند لا نیشن کی روشنی
میں آگے بڑھنے لگا۔ تھوڑی دور چل کر وہ اچانک کر کر پانی میں نظر آنے لگا۔ غالباً اس وقت نالے
میں تھا۔ دیکھتے دیکھتے وہ نالہ پار کر کے پھر کنارے کی طرف لوٹ آیا۔

”پلوواترو...!“ اس نے انہیں پکار کر کہا۔ ”لاست آف کر دو۔“

نوکروں کے علاوہ اور سب اتر پڑے۔ پھر وہ بھی تارچ کی روشنی میں آگے بڑھنے لگے۔

”زو رو نہیں چلے آؤ۔“ فریدی نے کہا۔

نالہ پار کر جانے کے بعد وہ دیہاتی راہبر کے پیچھے چلنے لگے۔ بوندیں اب بھی پڑ رہی تھیں۔
مگر زیادہ تیز نہیں تھیں۔ البتہ ہوا کے جھوکے تند ہوتے جا رہے تھے۔ نالے میں جھوکوں کی
شائیں شائیں کے علاوہ کوئی اور آواز نہیں سنائی دیتی تھی۔ وہ چلتے رہے۔ دفعتا قریب ہی کہیں سے
کسی کہتے کے رونے کی آواز سنائی دی اور راہبر چلتے چلتے رک گیا۔ اس نے چاروں طرف تارچ کی

روشنی ڈالنی شروع کی اور پھر فریدی کی طرف مڑا۔

"صاحب یہ تو...." وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

"میا بات ہے۔" فریدی اسے گھورتا ہوا بولا۔

"ہم پھر غلط آگئے۔"

"بجیب آدمی ہو تم۔" فریدی نے جلا کر کہا۔ "ابھی ابھی تم نے کسی قبے کا نام لیا تھا۔"

"بھی وہ تو نحیک ہے.... لیکن.... لیکن وہ سنئے۔" وہ خوفزدہ آواز میں بولا۔

"میا سنوں۔"

"میا آپ کچھ نہیں سن رہے ہیں۔" راہبر نے تھیر آمیز لمحے میں پوچھا۔

"میا فضول بکواس لگار کھی ہے تم نے۔"

"حضور.... یہ سنئے.... یہ آواز۔"

"کیوں؟ یہ کسی شیر یا گجرے ہوئے ہاتھی کی آواز تو نہیں۔ صرف کتے کی ہے اور وہ بھی بے چارہ رو رہا ہے۔"

"مگر صاحب یہ معمولی کتاب نہیں ہے۔" راہبر اپنے خٹک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا بولا۔

"چلو چلو آگے بڑھو۔" فریدی نے بیزاری سے کہا۔ "میں کتوں کے متعلق تم سے زیادہ جانتا ہوں۔"

"صاحب چاہے گردن کاٹ ڈالنے میں تو ادھر سے ہر گز نہ جاؤں گا۔"

"کیوں بھی آخر کیوں۔" فریدی نے زخم ہو کر کہا۔ "اس وقت بھی ہمارے پاس چھ رائفلیں

ہیں۔ ہم نہایت آسانی سے اسے ختم کر دیں گے۔"

"رائفلیں۔" راہبر خوفزدہ آواز میں چلنا۔ "جو کتا سینکڑوں بر س سے زندہ ہو۔"

"میا آپ نے سردار یہ راج کی گڑھی کے کتے کے متعلق کبھی کچھ نہیں سن۔"

"اے تو سناؤ تا ببا جلدی کرو! ورنہ اگر پھر بارش تیز ہو گئی تو ہم سب جنم رسید ہو جائیں

گے۔"

"وہ زمین پر نہیں ہے۔" راہبر نے کہا۔ "اس کی آواز اوپر سے آتی ہے اور وہ جب بھی روتا ہے ندی میں پاڑھ ضرور آتی ہے اور ندی کے کنارے بے ہوئے گاؤں تباہ و بر باد ہو جاتے ہیں۔"

فریدی نے ایک پر زور قہقہہ لگایا اور ساتھ ہی کتے کے رو نے کی آواز سنائی دی۔

”صاحب خدا کے لئے۔“ راہبر گھبرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہاں کوئی اس کا مٹھکہ اڑانے کی ہمت نہیں رکھتا۔ وہ کوئی خبیث روح ہے۔“

”شش آگے چلو۔“ فریدی سنجیدگی سے بولا۔ ”مجھے خیال پڑتا ہے کہ میں اس سے پہلے بھی اس کے متعلق کچھ سن چکا ہوں۔“

”تودوسری ہی طرف سے چلئے تا۔“ حمید نے جلا کر کہا
”نہیں محترم آپ اس معاملے میں قطبی دخل نہ دیجئے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا اور سب لوگ ہنس پڑے۔ لیکن راہبر کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تک نہ آئی پھر فریدی حمید کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”آپ خواہ تخلص مری جادی ہیں۔ یہاں کئی مرد آپ کی حفاظت کے لئے موجود ہیں۔“
”گھبرائے نہیں۔“

حمید نے بھنا کر اس کا ہاتھ جھکلتے ہوئے کہا۔ ”کہاں ہے۔ وہ سالی گڑھی دڑھی میں آگے چلو۔“
”گویا کہ مجھے اُو کا پانچ سمجھتے ہیں۔“

فریدی اس کی بات پر دھیان دیئے بغیر راہبر سے مخاطب ہو گیا۔

”تو تم ہمیں اس گڑھی ہی کی طرف لے جا رہے ہو۔“

”صاحب بس مجھے تو معاف ہی رکھئے۔“

”عجیب ڈرپوک آدمی ہو۔“

”اس معاملے میں ہمارے باپ دادا بھی ڈرپوک ہی تھے۔ لوگ دن کے وقت اور ہر سے گزرتے ہوئے ڈرتے تھے۔“

”ہم تمہیں باندھ کر لے چلیں گے۔“ حمید آگے بڑھ کر بولا۔

”یوں تو آپ مجھے سینیں قتل کر کے دفن بھی کر سکتے ہیں۔“ راہبر نے بے بسی سے کہا
”نہیں نہیں بھائی، ہم زبردستی نہیں کرتے۔“ فریدی نے نرم لپجھ میں کہا۔ ”تم چلوراہتا کرو اپس جا سکتے ہو۔“

”واپس اکیلے... یہ ظلم ہے۔“ وہ بے ساختہ بولا۔

”تم نے ہاک میں دم کر دیا۔“ فریدی نے جلا کر کہا۔ ”تھا انہا چلتے ہو اور نہ سیدھا۔“

"تو حضور کرتا کر نکل چلے ہیں۔ آپ لوگ بھی کافی بھیکے ہوئے ہیں۔"

فریدی کچھ سوچنے لگا۔ کتنے کے رونے کی آواز پھر آئی اور راہبر کے جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔

فریدی اپنے ساتھیوں کی طرف مز کر بولا۔ "کون کون چلے گا میرے ساتھ۔" "یار ہناؤ بھی۔" اشرف بولا۔

"خدا کے لئے اس حال میں تو طبیعت کو قابو میں رکھو۔" شاہد نے کہا۔ "ہم لوگ تمکر چور ہو گئے ہیں اور اگر جلدی ہی بھیکے کپڑے نہیں اتار دیتے تو شاید یہاں بھی پڑ جائیں۔" "میں تو کہہ رہا ہوں کہ تم لوگ جاؤ۔"

"بعض اوقات بڑی الجھنوں میں ڈال دیتے ہو۔" اشرف نے جھلا کر کہا۔

"سب بے کار ہے۔" حمید نے کہا۔ "آپ کے ساتھ سب سے بڑی بد نیستی یہ ہے کہ آپ بچپن ہی سے موت کی علاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں۔ مگر موت ہے کہ منہ لگانے پر تیار ہی نہیں ہوتی۔ تم لوگ جاؤ ورنہ ساری رات یہیں کھڑے کھڑے گزر جائے گی۔"

تحوڑی دیر تک سب کے سب کھڑے بھجناتے رہے۔ آخر فریدی پھر بولا۔

"فضول وقت نہ بر باد کرو ورنہ زیادہ رات گزر جانے پر کے جگاتے پھر گے۔ میں کسی ہدایتی کے تحت نہیں کہہ رہا ہوں۔ جلدی کرو۔"

"تم لوگ جاؤ۔" حمید منہ بناؤ کر بولا۔ "میں بھی سر کاری آدمی ہوں۔ بھوتوں کی مردم شماری میں مجھے بھی فریدی صاحب کا ہاتھ بٹانا چاہئے۔"

"کیا عورتوں کی طرح جلی کنی شنا رہے ہو۔" فریدی نے غصیلی آواز میں کہا۔ "تم میرے ساتھ نہیں جاسکتے۔"

تحوڑی دیر تک بحث ہوتی رہی اور پھر حمید کے علاوہ اور سب راہبر کے ساتھ ایک طرف روانہ ہو گئے۔

"تم بھی جاؤ۔" فریدی نے تیز لمحے میں کہا۔

"نہیں جاتا۔"

فریدی نارچ کی روشنی میں آواز کی سوت چل پڑا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد کسی بہت بڑی

ٹمارت کے ہندر نظر آنے لگے جن میں کئی بڑے بڑے مینار تھے۔ ہوا کے تیز جھوکوں کے ساتھ کتے کے رو نے کی آواز بد ستور سنائی دے رہی تھی۔

فریدی نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ اس وقت بارش بالکل ہتم گئی تھی اور مینڈ کوں کے شور سے کان پر ڈی آواز نہیں سنائی دیتی تھی وہ آواز.... اس روایتی کتے کی آواز اس شور پر حاوی تھی۔ وہ دونوں اس چھوٹے سے نوٹے پھوٹے قلعے کے قریب پہنچ کر رک گئے۔ لکھوڑی اینٹوں کی مضبوط دیواروں کے آثار اب بھی قائم تھے اور کہیں کہیں تو دیوار اپنی اصلی جسامت کے ساتھ اب بھی اپنی پاسیداری کے افسانے سناری تھی۔

کتے کے رو نے کی آواز کہیں قریب ہی سے آتی اور حمید بے ساختہ جیخ اٹھا۔

"خدا کی قسم اوپر ہی سے آرہی ہے۔" اس کا ہاتھ ایک طرف اٹھا ہوا تھا اور پھر پس مظفر میں صرف مینڈ کوں کا شور جاری رہا۔ فریدی نارج کی روشنی میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ نوٹی پھوٹی دیواریں اور اینٹوں کے ڈھیر حد نظر تک پہلے ہوئے تھے۔ کئی اونچے اونچے مینار تھے جن میں سے دو ایک اچھی حالات میں بھی تھے۔ دھلتا ہوا کا ایک جھوٹا آیا قریب ہی کوئی دیوار گری اور کتا پھر رو نے لگا۔ فریدی نارج سمیت تیزی سے پٹا اور روشنی کا اڑہ ایک مینار کے نچلے حصے سے پھسلتا ہوا اوپر کی طرف چلا گیا۔ آواز یقیناً اسی مینارے پر سے آتی تھی۔ سرجنت حمید اس کے قریب آگیا۔

"یہ گلیا..... کیا..... معام..... رہے۔"

"شش.... ڈرپوک۔" فریدی اس کا شانہ تپتچا کر مینارے کی طرف بڑھا۔

آواز پھر سنائی دی اور حمید ایک دبی سی جیخ کے ساتھ اچھل کر فریدی سے گمراہی۔

"اوپر سے... اوپر سے...!" وہ خوف زدہ آواز میں بولا۔

فریدی نارج کی روشنی میں مینارے کے نچلے حصے کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا قطر سات آٹھ فٹ سے کسی طرح کم نہ رہا ہو گا۔ ایک جگہ دروازے کے آثار بھی معلوم ہوئے۔ لیکن اب دہاں اینٹیں چھی ہوئی تھیں۔ فریدی نے ایک بار پھر نیچے سے اوپر تک روشنی ڈالی۔

"بظاہر کوئی ایسا راستہ نہیں معلوم ہوتا۔" وہ حمید کی طرف مزکر بولا۔

"جس سے کسی کتے کے گھنے کے امکانات ہوں۔"

"گھنے کے امکانات!" حمید نے بھرائی آواز میں کہا۔ "عقل کے ناخن لجھتے وہ سیکڑوں

سال سے....!"

"ہشت....!"

فریدی نے جنگ کر ایک پتھر انخلیا اور اسے ہاتھ میں لے کر تو لئے لگا۔ جیسے ہی منارے کے اوپر پری حصے سے آواز لگی اس نے وہ پتھر اوپر کی طرف پھینکا۔ کھٹاکے کی آواز آئی۔ پتھر نشانے پر بیٹھا تھا۔ لیکن کتنے کی آواز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

"یہ کیا کرنے لگے۔" حمید نے پوچھا۔

فریدی جواب دینے کے بجائے پتھر پتھر انخلانے کے لئے جھکا۔ اس بار پتھر اس نے آواز نکلتے ہی پتھر چلایا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر حمید کی طرف مڑ کر بولा۔

"ستا نہیں ہے.... آؤ چلیں.... پتھر دیکھیں گے.... اسے تمہارا ہاتھ کا نپ رہا ہے.... اکو کہیں کے۔"

"لیا معاملہ ہے۔"

"بیو پتھر بھی ہو لیکن.... ستا.... اسے۔" فریدی نے جست لگائی لیکن قریب ہی کی ایک گرتی ہوئی دیوار کی زد سے نفع سکا۔ سر جنت حمید کی جیخ سنائے میں دور تک لمبراتی چلی گئی۔ ستا پتھر مکروہ اور خونقاک آواز میں رونے لگا۔

جان پہچان

ہوش آتے ہی فریدی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ اب سر نہ انخلائے گا۔ کچھ دیر قبل پیش آیا ہوا واقعہ اس کے ذہن میں ابھر نے لگا اور اس نے زمین پر چت لیٹئے ہی لیٹئے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ زور گل کی دھنڈی روشنی ہوئی تھی۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کسی کتوں میں پڑا ہو۔ لکھوری ایشوں کی دیواریں ایک دائرے کی شکل اس بے گرد احاطہ کئے ہوئے تھیں۔ پھر دفاتر اسے حمید کا خیال آیا وہ ایک جھیکے کے ساتھ انہوں بیٹھا اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ کنوں تیزی سے گردش کرنے لگا ہو۔ زمین میں عجیب طرح کی آوازیں ایک دوسرے میں مدغم ہوتی چلی گئیں۔

ایک بار پھر اس نے سنبھالا لیا اور تجیر آمیز انداز میں چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اسے تو اخنوں کے ذہر میں ہوتا چاہئے تھا پھر... یہ... یہ... کیا... اس کنوں کی تہبہ بالکل خلک اور کسی کمرے کے فرش کی طرح صاف و شفاف بھی... کیوں؟ وہ بے تحاشہ کھڑا ہو گیا۔ اس نے حمید کو دیکھا، جو تھوڑے ہی فاصلے پر پڑا۔ گہری گہری سائیں لے رہا تھا۔ اس کے بھی سر ہی میں چوت آئی تھی اور کچھ خراشیں پیروں میں بھی تھیں۔ فریدی اس پر جھک گیا۔ وہ ابھی تک یہ یوں تھا۔ وہ کسی منت تک اس پر جھکا رہا پھر دفعتاً سیدھا کھڑا ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کرے۔ سر میں اتنی شدید تکلیف تھی کہ کھڑا ہونا وہ بھر ہو رہا تھا اور غراہت کا یہ عالم تھا جیسے وہ عرصے سے بیمار ہو۔ دفعتاً اس روشی کا خیال آیا۔ زرد رنگ کی دھنڈی روشی وہ بے اختیار اوپر کی طرف دیکھنے لگا۔ سترہ انحصارہ فٹ کی بلندی پر بننے ہوئے درپیوں میں اندر کی طرف چراغ روشن تھے جنہیں وہ پہلے نہیں دیکھ پا یا تھا اور اب اس کے دیکھنے ہی دیکھنے وہ سارے چراغ خود بخود رنگ کر باہر آگئے۔ فضائی معلق انسانی کھوپڑیوں میں سے روشنی کی لوئیں بچوت رہی تھیں اور اسی طرح کی چراندھ پھیلی ہوئی تھی جیسے ان میں چربی جل رہی ہو۔

فریدی کے جسم کے سارے روئیں کھڑے ہو گئے اور ماتھے پر پیسے کی نسخی نسخی بوندیں پھوٹ آئیں۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے پٹا اور دیوار سے نکل کر ان چراغوں کی طرف حرث سے دیکھنے لگا، جو آہستہ آہستہ پنجے اتر رہے تھے۔

اور پھر ایک عجیب ساقہ تھے سنائی دیا جو کسی خونخوار جانور کی غراہت سے مشابہ تھا۔ ایک طویل قبیٹ سے اس باؤلی کی دیواریں تک چینچھنا تھیں، سامنے کے در پیچے سے ایک چکاڈڑ چک چک کرتی ہوئی نکلی اور اوپر کی طرف پرواز کر گئی۔ قبیٹہ ختم ہو چکا تھا۔ لیکن اب ایک دوسری طرح کی آواز باؤلی میں گونج رہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کہیں کوئی ریچھ اپنے پیروں پر تھوڑتھی رکھے خرخ، خرخ کر رہا ہو۔

فریدی کا ہاتھ نے اختیار بیب کی طرف گیا۔ روپ اور موجود تھا۔ اس نے اس کا دست مغبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی نظریں اس در پیچے کی طرف اٹھ گئیں۔ جن سے چند لمحے پیشتر چکاڈڑ اڑی تھی۔ دو خونخوار آنکھیں اسے گھوڑی تھیں۔ انگاروں کی طرح دیکھتی ہوئی آنکھیں اور پھر وہی غراہت سے ملا چلتا ہوا قبیٹہ سنائی دیا۔ فریدی نے روپ اور والا ہاتھ بلند کیا لیکن نہ جانے کدر

سے ایک بڑی سی چگاڑ نے اسی پر باتھ پر جھپٹانمار اور ریو الور زمین پر آ رہا۔

فریدی اس چگاڑ کی طرف جھپٹا۔ اس نے ریو الور کو زمین پر گرتے نہیں دیکھا تھا۔ ایک تو سر میں شدید تکلیف تھی اس پر اس قسم کے واقعات اور سمجھا شاید چگاڑ ریو الور کو جھپٹ کر لے گئی۔ چگاڑ اپنے پر جھپٹتا تھی ہوئی اس کے سر پر چکر لگا رہی تھی۔ دفعتاً فریدی کو ان روشن کھوپڑیوں کا خیال آیا جو آہستہ آہستہ نیچے کی طرف آرہی تھیں۔ وہ پھر تیزی سے دیوار کی طرف چلا گیا اور اس سے نکلا کر اور پر دیکھنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ سے ایک تحریر آیزی جی کل گئی۔ اس کا ریو الور اور پر چلتی ہوئی کھوپڑیوں کے درمیان جھول رہا تھا اور وہ کھوپڑیاں نیچے آنے کے بجائے ریو الور سمیت اور پر کی طرف جاری تھیں۔

قہقهہ کی غراہٹ پھر سنائی دی۔ اس بارہہ ایک دوسرے در پیچے سے آتی معلوم ہو رہی تھی اور پر جا کر وہ کھوپڑیاں پھر چاروں طرف بننے ہوئے در پکوں میں ریک گئیں۔

خونخوار آنکھیں پھر دکھائی دیں حالانکہ وہ کافی بلندی پر نظر آرہی تھیں۔ لیکن فریدی کو ایسا محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی آنکھوں میں اتری آرہی ہوں۔ پھر ایک خوفناک مثلث دکھائی دی۔ سیاہ گھنے بالوں کے ذہیر میں خوفناک آنکھیں انگاروں کی طرح دیکھتی ہوئی آنکھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے کسی تاریک ویرانے میں دوچار غبل رہے ہوں۔ فریدی کا سر ایک جھٹکے کے ساتھ دیوار سے جا لگا۔ یہ اس کے زخمی سر پر دوسری چوت تھی۔ اسے یک بیک ایسا محسوس ہوا جیسے وہ گھر سے اندر ہیرے میں ڈوبتا چلا جا رہا ہو۔

نہ جانے وہ کب تک بے ہوش رہا اور ٹھیک اس وقت جب اس کا ذہن آہستہ غنوڈگی کی سطح پر آ رہا تھا۔ کچھ دیر قبل وائلی قہقهہ نما غراہٹ اس کے کانوں میں گوٹھی اور وہ نیم بے ہوش کی حالت میں انٹھ کر بینجھ گیا۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے سینے پر باتھ رکھ کر اسے دوبارہ لٹا دیا ہو۔ آنکھوں کے سامنے چھلایا ہوا غبار چھٹا جا رہا تھا اس کا باتھ بے اختیار سر کی طرف گیا۔ انگلیاں زخموں کی بجائے کسی نرم چیز سے نکلاں ایں اور اس نے چونکہ کر آنکھیں کھول دیں۔ اس نے خود کو ایک سلیتے سے سجائے ہوئے کمرے میں پیلا۔ اس کے نیچے ایک نرم اور ستمرا بستر تھا اور سامنے ہی فانوس میں کافوری شمعیں روشن تھیں۔ ایک سعمر اور وجہہ آدمی اس پر جھکا ہوا تھا جس کے پیچے پر گھری تشویش کے آثار نظر آ رہے تھے۔ قریب ہی نیم اور اشرف دکھائی

دیئے۔ فریدی نے پھر انھا چاہا لیکن اس پر بھلے ہوئے آدمی نے اس کے سینے پر ہولے سے ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”لیٹئے رہئے.... لیٹئے رہئے۔“

”میں کہاں ہوں۔“

”آپ قطعی محفوظ ہیں۔ گھبراۓ کی بات نہیں۔ زخم خطرناک نہیں ہیں۔ لیکن آپ کو آرام کی ضرورت ہے۔“ وہ ایک ہی سانس میں کہہ گیا۔

”جمید کہاں ہے؟ کیسا ہے۔“ فریدی نے اشرف سے پوچھا۔

”نمیک ہے.... نمیک ہے۔“

”کہاں ہے۔“ فریدی نے اپنے سینے پر رکھا ہوا تھا انھا کر انھتے ہوئے پوچھا۔

”دوسرے کمرے میں.... لیکن آپ لیٹئے رہئے۔“

”ہشت.... میں بالکل نمیک ہوں.... مجھے جمید کے پاس لے چلو۔“

فریدی انھ کر بینڈ گیا تھا۔ تھوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر دھنٹا اشرف کی طرف مزکر بولا۔

”ہم لوگ کہاں تھے؟“

”کوئی پریشانی کی بات نہیں۔“ معمر آدمی فریدی کے کامنے سے پر ہاتھ رکھتا ہوا بولا۔

”جو ہوتا تھا.... سو ہو گیا۔“

فریدی اسے گھورنے لگا۔ پھر اشرف کو مخاطب کر کے اس کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔

”آپ کی تعریف....!“

”اوہ آپ....!“ ارشد نے خاکسارانہ انداز میں کہا۔ ”آپ.... آپ نواب صاحب۔“

”مجھے صولت مرزا کہتے ہیں۔“ معمر آدمی نے کہا۔

”اوہ....!“ فریدی نے اس کی طرف مصالغے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ہم لوگوں کی وجہ سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔“

”نہیں.... کوئی تکلیف نہیں۔ لیکن آپ لیٹ جائیے۔“

”میں اپنے ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

”آپ مجھ پر اعتقاد کیجئے۔“ نواب صولت مرزا مسکرا کر بولا۔

فریدی چپ چاپ لیٹ گیا۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد اس نے اشرف سے پوچھا کہ وہ دونوں انہیں کہاں ملے تھے۔

"تم دونوں ایک گری ہوئی دیوار کی طبیعے میں دبے پڑے تھے۔" اشرف نے کہا۔

فریدی انہوں کو پیش گیا۔ وہ تھیر آمیز انداز میں اشرف کو گھورتا رہا۔

"کیوں؟ کیا بات ہے۔"

"کچھ نہیں۔" فریدی نے پر خیال انداز میں آہستہ سے سر جلاایا۔ پھر دفعتاً پوچھ چکا۔

"میرا کوت کہاں ہے۔"

اشرف نے سامنے والی دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ جہاں اس کا کوت لٹکا ہوا تھا۔

"ریو الور ہے اس میں۔" فریدی نے پوچھا۔

"ہاں...!"

"اوہ....!" فریدی کے منہ سے بے اعتیار نکلا اور وہ پھر لیٹ گیا۔

وہ پراسرار باوی اور اس کا ذرا راؤ نہ ماحول۔ کیا وہ سب خواب تھا۔ فریدی انتشار میں جلا ہو گیا۔

وہ خوفناک چہرہ جلتی ہوئی مغلظ انسانی کھوپڑیاں۔ قہقہہ نما غراہت آخر یہ سب کیا تھا۔ پہلی بار وہ

یقیناً ایک گرتی ہوئی دیوار کے لپیٹ میں آکر اپنے ہوش و حواس کو بیٹھا تھا۔ لیکن دوسرا یہ چوٹی؟

کیا وہ حق خواب تھی؟ وہ سوچتا رہا اور اس کے ذہن نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ سب حقیقت تھی۔

لیکن پھر! پھر وہ گرتی ہوئی دیوار کے طبیعے میں دوبارہ کس طرح پہنچے تھے۔ وہ ریو الور ہے وہ

کھوپڑیاں اپنے ساتھ اڑا لے گئی تھیں اس کے جیب میں دوبارہ کس طرح آیا؟ کیا وہ شیطانی

کتا...؟ لیکن وہ اس کے آگے نہ سوچ سکا۔ کیونکہ مافق الفطرت چیزوں کی اس کی نظر وہ میں میں

کوئی اہمیت نہ تھی۔

"کیا تم یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہو کہ تم نے ہمیں بلے کے ذہر سے نکلا تھا۔" فریدی نے

اشرف سے پوچھا۔

"ہاں بھی...!"

صولت مرزا بڑے غور سے فریدی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ دفعتاً اس کے ہونوں پر ایک

پر خیال سی سکراہت پھیل گئی۔

"بھول جائے۔ سب کچھ بھول جائے۔" نواب صولت مرزا معنی خیز انداز میں سر ہلا کر بولا۔ "جو ان کا خون اکثر غلط راستوں پر بھی لے جاتا ہے۔" "میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔" فریدی نے کہا۔

"مجھے آپ کے دوستوں سے معلوم ہو چکا ہے کہ آپ وہاں کس لئے گئے تھے۔" صولت مرزا مسکرا کر بولا۔ "یہ آپ کا غیر و اشمندان اقدام تھا۔ کوئی دن میں بھی ادھر جانے کی ہمت نہیں کرتا۔ مگر خیر شاکر آپ اس کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔" فریدی خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کے انداز سے ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ صولت مرزا ہی کی زبانی کچھ اور بھی سننا چاہتا ہو۔

"ہمارے قبیلے کے تین مخچے بوان" صولت مرزا پھر بولا۔ "اسی خط کا شکار ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ایک تو کچھ دن یہاں رہ کر چل بسا اور بقیہ دو آج تک صحیح الدماغ نہیں ہو سکے۔" "اوہ....!" فریدی نے دیپی کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ "کب کی بات ہے۔" "پانچ سال قبل کی بات۔ وہ تینوں اس کے کاراز معلوم کرنے گئے تھے۔" "پھر....!"

"دوسرے دن صحیح ان کھنڈ روں میں بے ہوش پائے گئے۔" "تو کیا یہ حقیقت ہے کہ اس کی آواز سالہا سال سے سنائی دیتی ہے۔" "میں نے تو اپنے بزرگوں سے بھی سنائے۔" صولت مرزا نے جماہی لیتے ہوئے کہا۔ "بس اب آرام کرو۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تمہیں آرام کی ضرورت ہے۔" "میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ہاں تو اگر یہ بات ہے تو کم از کم آپ بھی اسے بچپن ہی سے سخت آئے ہوں گے۔"

"ہاں بھی میں صحیح سب کچھ بتاؤں گا مجھے باتوں میں بہلانے کی کوشش نہ کرو۔ تم بالکل اپنے باپ کی طرح جگلی معلوم ہوتے ہو۔"

"کیا آپ ان سے واقف ہیں۔" فریدی نے پوچھا۔

"بنیے تم ہمیں بھول گئے ہو.... لیکن ہم نہیں بھولے۔"

"اُرے بھی نواب عزیز الدین خان میرا نگو شیلار تھا۔... آگسٹو ڈی میں ہم دونوں ساتھ ہی تھے۔"

"لیکن آپ کو میرے متعلق کیسے معلوم ہوا۔"

"تمہارے دوستوں نے بتایا۔ اچھا میاں کمال بس چپ چاپ سونے کی کوشش کرو۔ حالانکہ زخموں میں تکلیف ہو رہی ہوگی۔"

"میں سونے سے پہلے اپنے زخمی ساتھی کو دیکھنا چاہتا ہوں۔"

"بھی بڑے ضدی ہو! اچھا چلو...!"

صوات مرزا نے فریدی کو سہارا دے کر انخلایا اور پھر وہ اس کرے میں آئے جہاں حمید ایک مسہری پر گاؤں تک سے لیک لگائے بیٹھا کافی پی رہا تھا۔ اس کا سر بھی سفید نہیں سے ڈھکا ہوا تھا۔ فریدی کو دیکھتے ہی اس نے ایک فلاں شگاف قبتهہ لکایا اور صوات مرزا مگر اکر فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میں تو سمجھا تھا کہ آپ اس مینار کی چوٹی پر ہوں گے۔" حمید نے فریدی سے کہا اور فریدی صوات مرزا کی طرف مڑ کر بولا۔ "مطمئن رہنے اس کا داماغ خراب نہیں ہوا۔"

پھر وہ مسہری کے قریب پڑی ہوئی ایک آرام کری پر نیم دراز ہو گیا۔ نواب صوات مرزا نے بھی ایک میز کے کونے پر نکل کر حمید کے چہرے پر خیال انداز میں نظریں بخادیں۔ حمید کافی کی پیالی فیضی پر رکھ کر اپنے پاس میں تمبا کو بھرنے لگا۔

"میرے نوکر کہاں ہیں۔" فریدی نے نیم کی طرف مڑ کر پوچھا۔

"سب آگئے ہیں اور گاڑی بھی۔" نیم نے جواب دیا۔

"تو تم بختی ہو۔" فریدی نے حمید سے پوچھا۔

"بد بختی سے۔" حمید منہ سکوڑ کر بولا۔ "خدا نے چاہا تو اب کی صفائی ہو جائے گا۔"

انجمنی سنجیدہ ماحول ہونے کے باوجود بھی شاہد اور اشرف بے ساختہ نہیں پڑے۔

"تم نے کوئی ذرا اتنا خواب تو نہیں دیکھا۔" فریدی نے مسکرا کر پوچھا۔

"یہ نہیں تھی ورنہ ضرور دیکھتا۔" حمید نے پیزاری سے کہا۔

"میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ لوگ بھی اس معاملے میں سنجیدہ نہیں ہیں۔" صورت مرزا نے کہا۔

"قبل نواب صاحب۔" حمید نے دھوئیں کا بڑا سا بادل پھوڑتے ہوئے کہا۔ "جہاں نکل

میری ذات کا تعلق ہے۔ میں مر جانے کی حد تک سنجیدہ ہو چکا ہوں۔"

"میں نے یہ بھی سنائے۔" فریدی نے نواب صولت مرزا کو مخاطب کر کے کہا۔ "کہ جب بھی وہ کتاب و تابے قریب کی ندی میں پاڑھ آجائی ہے اور اس کے کنارے بے ہوئے گاؤں بہت جاتے ہیں۔"

"قطعی درست ہے۔ ابھی ابھی میری لاریاں جڈا پور کے مصیبت زدگان کو لے کر یہاں آئی ہیں۔ تھوڑی دیر قابل میں بھی وہیں تھا۔ آدمی سے زیادہ گاؤں بہت گیا ہے۔ تم نپچے ذوب گئے ہیں۔ اپنے بچپن سے اس قسم کے واقعات دیکھتا آ رہا ہوں۔ اچھا بھی اب تم لوگ آرام کرو۔ مجھے ان بیچاروں کا بھی انتظام کرنا ہے اور ہاں... ذاکر نے تم دونوں کو صرف سیال چیزیں استعمال کرنے کے لئے کہا ہے۔ چائے... کافی یاد دو دو۔"

صولت مرزا اپنے نوکروں کو کچھ ہدایت دیتا ہوا باہر چلا گیا۔

"اب بتاؤ...!" فریدی نے حمید کو مخاطب کیا۔

حمد کوئی جواب دینے کے بجائے اُنی پرانی پر رکھے ہوئے ایش ثرے میں پاپ کی راکھ جہاڑ کر لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔

فریدی تھوڑی دیر تک پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اشرف کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔

"تم لوگ وہاں کس طرح پچھے تھے۔"

"ہم دوسری طرف سے گھوم کر یہاں پہنچے۔" اشرف سگریٹ سلگاتا ہوا بولا۔ نواب صاحب موجود نہیں تھے۔ وہ شاید جنک پور کے سیالاب زدگان کی امداد کے لئے گئے ہوئے تھے۔ لیکن یہاں نوکروں کو بدایت دے گئے تھے کہ اگر ان کی عدم موجودگی میں کوئی پناہ لینے کے لئے آئے تو اسے ساری آسانیاں بہم پہنچائی جائیں۔ لہذا ان کے نوکر پہلے تو ہمیں سیالاب زدہ سمجھے لیں گے جب ہم نے انہیں پوری بات بتائی تو انہوں نے ہمارے لئے معقول انتظام کر دیا۔ پھر تقریباً ایک گھنٹے تک ہم تمہارا انتظار کرتے رہے۔"

"خیر...!" فریدی نے اس کی بات کا نتے ہوئے کہا۔ "تو تمہیں اچھی طرح یاد ہے کہ ہم ملے میں دبے ہوئے تھے۔"

"تم آؤ۔ بار بار اس کے متعلق کیوں پوچھ رہے ہو۔" اشرف نے کہا۔

"انہیں یقین نہیں آ رہا ہے۔" حمید دفاتر اٹھا کر بولا۔ "کوئی نکد یہ اس وقت ملکہ الزبح کے ساتھ دعوت اڑا رہے تھے۔"

"تو ابھی تم زندہ ہو۔" فریدی نے مسکرا کر کہا اور حمید بھنا کر انہے بیٹھا۔

"سخے جتاب اجنم میں گیا آپ کا ایڈن پر۔ میں اب کسی مزید حفاظت کے لئے تیار نہیں۔"

"چپ چپ شور نہیں کرتے۔ بس اب تو بارہ نج رہے ہیں۔" فریدی نے ہونوں پر انگلی رکھتے ہوئے کہا۔

"ذائق میں مت نالئے۔ ہم صبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے۔ مجھ میں بھوتوں سے لڑنے کی تاب نہیں۔"

"بھوتو...!" فریدی مسکرا کر بولا۔ "کیسے بھوتو... پاگل ہوئے ہو، ایک بھی ہوئی دیوار تھی، جو ہوا کا تیز جھوٹکا برداشت نہ کر سکی اور بس۔"

"تو پھر وہ میثار پر رونے والا کتا میرا چخارہ ہو گا۔"

"بہت ممکن ہے وہی ہو۔" فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔ پھر اشرف کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ "تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔"

"بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ تم دونوں گرجی ہوئی دیوار کے لمبے میں دبے ہوئے تھے۔" اشرف آتا کر بولا۔

"کیا وہاں قریب ہی کوئی باوٹی بھی تھی۔"

"باوٹی کیا...!" اشرف نے پوچھا۔

"پاگل عورت کو کہتے ہیں۔" حمید نے سنجیدگی سے کہا۔

"آپ بھی جاہل ہیں۔" فریدی منہ سکونٹ کر بولا۔ "باوٹی ایک حرم کا کنوں ہوتا ہے جس میں نیچے جانے کے لئے سیر ہیاں ہوتی ہیں اور پانی کی سطح سے تھوڑی ہی اوپرچائی پر درستچے اور برآمدے بنے ہوتے ہیں۔ قدیم زمانے میں ایسے کنوئیں گرمیوں کے زمانے کی عیاشیوں کے لئے بخواہے جاتے تھے۔"

"نہیں ہمیں وہاں کوئی ایسی چیز نہیں دکھائی دی تھی۔" اشرف نے کہا اور اچھی بات تو یہ ہے کہ ہم نے اور ہر اور دیکھنے کی بہت ہی نہیں کی۔ حالانکہ ہم تعداد میں ہیں تھے اور نواب صاحب

کے نوکروں کے پاس بھی بندوقیں تھیں۔ لیکن خوف کے مارے سب کا حال پتا تھا۔ میرا خیال ہے کہ اگر خود تواب صاحب چلنے پر آئادہ نہ ہو گئے ہوتے تو ان کے نوکروں کو کوئی طاقت اس وقت ان کھنڈروں میں نہیں بیسج سکتی تھی۔

"لہجی بس....!" حمید پھر اٹھا کر بولا۔ "باری دنیا میں دو ہی تمیں مارخان لختے ہیں۔ ایک میں اور دوسرے آپ۔" اس نے مصلحت خداوند از میں فریدی کی طرف اشارہ کیا۔

پُر اسرار لڑکی

"تم ابھی بحکم سوئے نہیں۔" فریدی بولا۔

"آپ لوگ جھک ماریئے۔ ہم تو چلے۔" اشرف امتحنا ہوا بولا۔ "نہ جانے کس کی صورت دیکھ کر گمراہے چلے تھے۔"

"آئینہ دیکھا ہو گا۔" حمید آنکھیں بند کئے ہوئے بڑھ لیا۔

در دوازہ کھلا اور ایک نوکر ہاتھوں پر ٹرے اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا جس میں گرم دودھ کا جگ اور دو گلاس تھے اس کے بعد ایک دوسرا نوکر اندر آیا اور اس نے اشرف وغیرہ سے کھانے کے لئے کہا۔ وہ لوگ اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلے گئے۔

"کیوں بھی تھیں دودھ چاہئے۔" فریدی نے حمید کو مخاطب کر کے کہا۔ "مجھے تو خواہش نہیں۔"

"میں کمزوری محسوس کر رہا ہوں۔" حمید امتحنا ہوا بولا۔

نوکرنے اس کی طرف ہاتھ بڑھ لیا اور پھر حمید نے دو گلاس صاف کر دیئے۔

نوکر استفہامیہ انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

"مجھے دودھ نہیں چاہئے۔" فریدی بولا۔ "اگر کافی تیار ہو تو لاو... درست نہیں۔"

"تیار ہے حضور۔" نوکر قدرے جھک کر بولا اور ٹرے اٹھا کر چلا گیا۔

حمدی دوبارہ پاپ سلگا رہا تھا۔ وہ تھوڑی دیر فریدی کو دیکھتا رہا پھر بڑھاتا ہوا لیٹ گیا۔ "پتہ

نہیں کون آکو کا پتہ؟ اکثر تھا جس نے صرف دودھ کی اجازت دی ہے۔ لعنت ہے اس زندگی پر

بھلا دیوار میں دب کر بھی زندہ رہنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”کیوں فضول ہائیں ہائیں چار کمی ہے۔“

”فضول ہائیں ہائیں۔“ حمید ایک جھلکے کے ساتھ انٹھ بیٹھا۔ ”یہ فضول ہائیں ہائیں ہے.... اور یہ فض.... خو.... ل....!“

دفعتاً اس کامنہ حرمت سے کھل گیا۔ وہی طرف کے ملحقہ کرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور ایک انتہائی حسین لڑکی شبِ خوابی کے لبادے میں ملبوس کھڑی انہیں غمناک انداز میں دیکھ رہی تھی۔ اس کے بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے۔ اس کی عمر انہیں یا میں سے کسی طرح زیادہ نہیں معلوم ہوتی تھی۔ فریدی کھڑا ہو گیا۔

”میں تم لوگوں کے لئے معموم ہوں۔“ لڑکی نے مضھل آواز میں کہا۔

”کوئی ایسی بات نہیں۔“ فریدی مسکرا کر بولا۔ ”ہمارے زخم معمولی ہیں۔ البتہ آپ کی ہمدردی کا شکر یہ۔“

”تم میں سے فرقلوس کا پیٹا اور سرس کون ہے۔“ لڑکی نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

فریدی اور حمید گھبرا کر ایک دوسرے کی صورتیں دیکھنے لگے۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے تجیر آمیز لمحے میں کہا۔

”اوہ شاید تمہیں ٹھوں نے پاگل کر دیا ہے۔ تم دونوں زخمی ہو۔ لیکن گھبراو نہیں۔ زفروں... میرا زفروں تمہارے لئے لڑ رہا ہے۔ وہ تمہارے دشمنوں کو نکست دے کر ایک دن ضرور واپس آئے گا۔ مجھے دیکھو.... میں خود یہاں اسیر ہوں۔ لیکن مجھے امید ہے کہ ایک دن زفروں مجھے اس قید سے رہائی دلائے گا۔ کئی دنوں سے میرے کچھ سپاہی یہاں آتے ہیں۔ وہ موقعے کی علاش میں ہیں۔ کسی دن یہاں شبِ خون ضرور ماریں گے۔“

”محترمہ شاید آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔“ فریدی نے سنجیدگی سے کہا۔

لڑکی کے ہونٹوں پر ایک بے جانی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نمیک ہے مجھے غلط فہمی ہی ہوئی ہے۔ تم بھی انہیں میں سے معلوم ہوتے ہو جنہوں نے مجھے قید کر رکھا ہے۔ میں یہ سمجھی تھی کہ شاید تم نے رومنوں کے خوف سے یہ بھی اختیار کیا ہے۔“

”آپ کو کس نے قید کر رکھا ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

اس عمارت کے مالکوں نے۔ میں سالہا سال سے غلامی کی زندگی بھر کرتی آ رہی ہوں۔ میں اس عمارت سے باہر نہیں نکلتے پاتی.... کاش! میرا زفروں یہاں جلد سے جلد بخیجی جائے۔ مجھے اپنے باغ کے گلاب بہت یاد آتے ہیں۔ مجھے اس معبد کی یاد بہت پڑتی ہے جہاں سنگ مرمر کی غصیم بیڑھی آسان کی طرف اپنے بازو اٹھائے اسیل مرغوں کی قربانیاں تقول کرتی ہے۔ مجھے اپنے محل کے عظیم الشان درپیچے یاد آتے ہیں جن پر شاداب شاموں کی سرخیاں رنگ مار کرتی ہیں اور محل کے نیچے بہتے ہوئے دریا میں طلائی کشتیاں تیرتی ہیں۔ مجھے اپنے دو سیاہ رو غلام یاد آتے ہیں جو میری لئے رنگ رنگ کی نرمی مچھلیاں پکڑ کر لاتے تھے اور میں انہیں شمشے کے بڑے بڑے مر جانوں میں ڈالوادیتی تھی۔ مجھے میرا زفروں بہت یاد آتا ہے جس کے بازوؤں میں فولادی مچھلیاں مچلتی تھیں جس کے فراخ بینے پر سر رکھ کر میں سب کچھ بھول جاتی تھی۔“
وہ خاموش ہو گئی۔ فریدی اور حمید حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حمید سوچ رہا تھا کہ شاید وہ لڑکی انہیں آکو بنا رہی ہے۔

”آپ کس زمین سے تعلق رکھتی ہیں۔“ حمید نے شرات آمیز مجھے میں پوچھا۔

”مصر.... ہائے میرا مصر.... میں تھیں کبھی نہیں بھول سکتی۔“

”مصر....!“ فریدی چوک کر بولا۔ وہ غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”ہاں مصر....!“ لڑکی کی آواز سے دبادبا سا جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ ”ایک دن تم سب غلام ہتا لئے جاؤ گے۔ شاید جسمیں ہمارے جگبھو آدمیوں کا تجربہ نہیں۔ وہ جن کے نیزدیں کی ایساں سورج کو آنکھیں دکھاتی ہیں وہ جن کی ڈھالوں پر خونخوار عقابوں کی تصویریں ہیں۔ وہ جنمیوں نے رومنوں اور یونانیوں کے چکے چھڑا دیئے تھے۔ وہ جنمیوں نے سلو نیو جیسے جلال و جبروت والے کی آنکھیں نکال کر کتوں کے سامنے ڈال دی تھیں۔ وہ اس عمارت کی ایسٹ سے ایسٹ بجادیں گے۔
ان دیواروں کو ہیں ڈالیں گے جنمیوں نے مجھے قید کر رکھا ہے۔“

لڑکی خاموش ہو گئی۔ اسی دوران میں دوسرے کمرے سے دو عورتیں آنکھیں تھیں۔ ان میں

سے ایک سعتر تھی اور دوسری کمن جس کی عمر پندرہ یا سولہ کے قریب رہی ہو گئی۔

”باتی! باتی!...!“ کمن لڑکی نے آگے بڑھ کر اسے جنجموڑا اور وہ یک بیک پلٹ پڑی۔

”تم دونوں میری بوٹیاں نوچنے کے لئے آنکھیں۔“

"بھیلہ....!" مغم عورت نے اسے پلا کر دروازے کی طرف کھینچنے ہوئے کہا۔ "خدا کے لئے ہوش میں آؤ۔"

وہ اسے دوسرے کرے میں کھینچ لے گئی اور کمن لڑکی نے شرماتے ہوئے انداز میں فریدی سے کہا۔

"آپ لوگ کچھ خیال نہ کیجئے گا۔ یہ اس وقت ہوش میں نہیں تھیں۔"

قل اس کے فریدی کچھ کہتا ہے بھی دوسرے کرے میں چلی گئی اور دروازہ بند ہو گیا۔

فریدی اور حمید تھوڑی دیر تک حیرت سے ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے پھر حمید بولا۔ "میا شامت ہے۔"

فریدی کچھ بولنے ہی والا تھا کہ نوکر کافی کی ٹرے لے کر آگیا۔ اس نے فریدی کی کرسی کے قریب فلی پائی کھکا کر ٹرے رکھ دی۔

"اے بھی یہاں ایک پاگل عورت تھیں آئی تھی۔" فریدی نے آہت سے کہا۔

"پاگل عورت...!" نوکر چونک کر بولا اور پھر پر تشویش انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔ "شاید وہ مصر کی رہنے والی ہے۔"

"اوہ....!" نوکر نے سجدگی سے کہا۔ "وہ مجھلی سرکار ہوں گی۔"

"مجھلی سرکار۔" فریدی نے کہا۔ "یعنی نواب صاحب کی مجھلی لڑکی۔"

"جی حضور...!"

"تو کیا وہ کچھ یہاں ہیں۔"

"جی ہاں.... کافی خندی ہو جائے گی۔"

فریدی نے محسوس کیا کہ وہ بات نالئے کی کوشش کر رہا ہے۔

"ہم لوگ تو ہری طرح ڈر گئے تھے۔" فریدی پیاسی میں کافی اشیتا ہوا بولا۔

نوکرنے کوئی جواب نہیں دیا۔

"میا وہ بہت پڑھتی ہیں۔"

"جی ہاں۔"

"لیکن وہ صورت سے تو یہاں نہیں معلوم ہوتی۔"

”جی صاحب۔“

”تم یہاں کب سے ہو۔“

”تین سال سے۔“

”تو تمہیں ان کی بیماری کے متعلق نہیں معلوم۔“

”نہیں صاحب۔“

”میادہ کبھی مصر میں بھی تھیں۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“

”ہمارے نوکر تو... ہماری ایک ایک بات جانتے ہیں۔“ فریدی پیاری رکھ کر نوکر کی طرف

دیکھتا ہوا بولا۔

”جی صاحب۔“ اس کے چہرے پر پچھاہٹ کے آثار تھے۔

”اور تم اپنی محلی سرکار کی بیماری کے متعلق بھی نہیں جانتے۔“ فریدی نے دھیرے سے کہا۔
نوکر شش ویعہ میں جلا ہو گیا تھا۔ آخر وہ آہستہ سے بولا۔

”ان پر کسی جن کا سایہ ہے۔“

فریدی خاموش ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی کافی ختم کی اور نوکر کو رخصت کر دیا۔

”اڑے باب رے باب۔“ حید بوكھلا کر اٹھتا ہوا بولا۔ ”سارے جن بھوت پریت نہیں اکھا
ہو گئے ہیں۔ شامت قلابازیاں کھاتی دکھاتی دیتی ہے۔ خدا را نکل بھاگنے۔ یہاں سے.... میں ان
چیزوں سے نہیں لا سکتا جو دکھائی نہ دیں۔ رہے آپ... تو آپ تو ہوا سے لٹنے کی خاصی مشق
بہم پہنچا پکھے ہیں۔“

”ٹھٹھا اپ...!“ فریدی نے آہستہ سے کہا اور سگار سگانے لگا۔

”میں تو صحیح جمل دوں گا۔“

”بکواس ہے.... تمہیں یہاں سفر ناپڑے گا۔ میں اس کے کوئی نار سے نکال کر پلانے کا ارادہ
رکھتا ہوں۔“

”اڑے تو پلانے ہا۔“ حید دانت کٹکٹانا کر بولا۔ ”منع کس پڑھے کے آؤ.... آؤ کے پڑھے نے کیا
ہے۔ لیکن میں رک نہیں سکتا۔“

خیر تمہاری سکھیاں بھی رکیں گی۔“

”مجھے کوئی اعتراض نہیں۔ انہیں چاہے روکئے چاہے مار دالے۔ لیکن مجھے تو بخشنا ہی پڑے گا۔“
فریدی کری سے انٹھ کر اس کی مسہری پر جا بیٹھا۔

”اب کیا ارادہ ہے۔“ حمید اچھل کر ایک طرف ہٹتا ہوا بولा۔

”میں نے اتنی خوبصورت لڑکی آج تک نہیں دیکھی۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔
”بس بس مجھے زیادہ گھنٹے کی کوشش نہ کریج۔“ حمید نے کہا۔ ”ارے باپ رے باپ اس کے

جنگجو سپاٹی۔“

”بہر حال تم جانبیں سکتے۔“

”میں روہاں سے اپنا گلا گھوٹ لوں گا۔“

”کوئی بات نہیں۔ اس سے پہلے کوئی اچھی ہی وصیت ضرور چھوڑ جانا۔“

”بند امیں عاجز آگیا ہوں۔ گلوخا صی کے لئے موت کے علاوہ کچھ اور نہیں دکھائی دیتا۔“

”تو پھر مردی جاؤ، تجھیں دلخیں معقول کر دی جائے گی۔“

حمد کوئی جواب دیئے بغیر لیٹ گیا۔

فریدی اسے خوفناک بادلی کے متعلق بتانا چاہتا تھا۔ لیکن پھر اس نے اپنا ارادہ ترک کر دیا۔ وہ حمید کو بزرگ نہیں سمجھتا تھا لیکن یہ ضرور جانتا تھا کہ وہ مافق الفطرت چیزوں پر کچھ نہ کچھ لیکن رکھتا ہے اگر اسے بادلی والی بات معلوم ہو گئی تو وہ کسی طرح نہ رک بسکے گا۔ اس کا ذہن ان متحرک اور متعلق کھوپڑیوں میں الجھا ہوا تھا اور وہ عجیب و غریب اور خوفناک درندہ۔

اس دوران میں کئی بار اس کا ذہن نواب صاحب کی مجھلی لڑکی کے پراسرار دیے کی طرف بھی منتقل ہوا لیکن وہ اس کے متعلق کچھ زیادہ سوچنے پر تیار نہیں تھا۔ کیونکہ اس میں ساری علاقوں کی ذہنی مرض کی پائی جاتی تھیں۔ البتہ وہ اس کے متعلق وضاحت سے چانتا چاہتا تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک بیٹھا بیٹھا خیالات سے البتا رہا پھر جانے کے لئے انھا۔

”یہاں پڑے....!“ حمید نے پوچھا۔

”تم سوئے نہیں.... میرا بستر شاید اس کرے میں ہے۔“

”بھی نہیں.... قطعی نہیں.... میں اس بھوت گھر میں تھا نہیں رہ سکتا؟“

"بھیبِ الحق ہو۔"

"آپ مجھے عجیب اکو بھی کہہ سکتے ہیں لیکن میں...!"

"میا کبواس ہے... ایک لڑکی سے ڈرتے ہو۔"

"پاگل لڑکی.... کمال کرتے ہیں آپ بھی۔" حمید جلا کر بولا۔ "کیا آپ کونو کر کی بات یاد نہیں۔"

"می ہاں۔" فریدی نے من سکوڑ کر کہا۔ "اس پر کسی جن کا سایہ عاطفہ ہے اور آپ اتنے

گنوار ہیں کہ اس پر ایمان لے آئے ہیں۔ مجھے خواہ جوہا تک مت کرو۔"

"میں آپ کو کس طرح سمجھاؤں کہ میں قطعی سنجیدگی سے کہہ رہا ہوں۔"

"اُرے احتیت تو آدمی ہو کر جتوں سے ڈرتا ہے۔ تف ہے۔ تجھے گدھے پر۔" فریدی جلا کر

بیٹھتا ہوا بولا۔ "مجھے نہیں معلوم تھا کہ تمہارے اندر اتنی بوڑھی روح سک رہی ہے۔"

"اس وقت اگر آپ مجھے گدھے کے بجائے جرئت بھی کہد دیں تو میں نہ انتہا مانوں گا۔"

حید نے مسکرا کر کہا۔

"بکومت...!" فریدی آرام کری کی پشت سے لیک لگاتا ہوا بولا۔

حید سمجھ گیا کہ وہاب نہیں جائے گا۔

"آپ یہاں مسہری پر آ جائیے۔ میں کری پر سو جاؤں گا۔" حید نے کہا۔

"نہیں جی... سوئے۔" فریدی نے آنکھیں بند کر لیں۔

حید چپ چاپ لیٹ گیا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے آہتہ آہتہ فریدی کو آوازیں دیں لیکن وہ سوچ کا تھا۔

حید نے لاکھ کوشش کی کہ وہ بھی سو جائے لیکن نیند نہ آئی۔ وہ نہ اسرار لڑکی اس کے ذہن پر نہی طرح چھائی ہوئی تھی۔ اس کی خواب ناک آنکھیں، سپاٹ چہرہ، عالم تھیر میں بار بار جھکتی ہوئی چلکیں۔ گفتگو کرتے وقت اعتماد کی غیر مانوسی جنبش... یہ ساری چیزوں ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آرہی تھیں۔ دفعتاً اس کی نظریں اس دروازے کی طرف اٹھ گئیں جس سے وہ داخل ہوئی تھی۔ وہ یک بیک اٹھ بیٹھا اور چبوں کے مل چلتا ہوا دروازے کی پنجی گرا کر پھر مسہری پر لوٹ آیا۔

وہ دن چڑھے تک سوتے رہے۔ فریدی نے آنکھ کھولتے ہی سب سے پہلے نواب صولت

مرزا کو دیکھا جو قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"بھتی کمال میاں تم واقعی اپنے باپ کی نقل ہو۔" اس نے کہا۔ "بھلا اس کرسی پر سونے کی کیا ضرورت تھی۔"

"اوہ.... اور اصل میں باتیں کرتے کرتے سو گیا تھا۔"

"میں نے منع کیا تھا ان کہ زیادہ باتیں نہ کرنا۔ خیر یہ ہتا ذکر طبیعت کیسی ہے۔"

"میں بالکل اچھا ہوں حمید او حمید۔"

"بھتی سونے دوتا.... اسے کیوں جگاتے ہو۔"

حمید کھڑ پیدا کر انہوں بیٹھا۔

صوات مرزا تھوڑی دیر تک ان سے ان کے زخموں کی کیفیت معلوم کرتا رہا پھر انہوں کر چلا گیا۔ وہ دونوں ضروریات سے فارغ ہو کر باہر آئے۔ صوات مرزا کے طویل و عریض مکاتاں کے برآمدے اور کمرے پنہا گز نہوں سے بھرے ہوئے تھے اور وہ خود دوڑ دوڑ کر ان کی دیکھے بھال کر رہا تھا۔ فریدی اور حمید کو دیکھ کر وہ ان کی طرف چلا آیا۔

"بھتی تم لوگوں نے ناشتہ کیا یا نہیں۔"

"ابھی نہیں.... ہم یوں بھی دیر سے ناشتہ کرنے کے عادی ہیں۔" فریدی نے کہا۔

"دیکھو یہ تمہارا اگر ہے کسی تم کا تکلف نہ کرنا۔ جس وقت جس چیز کی ضرورت ہو کہہ دینا کیوں نکل میں نہیں طرح مشغول ہوں ورنہ خود ہی دیکھے بھال رکھتا۔"

"اوہ! آپ اس کی فکر نہ کیجئے گا" فریدی نے کہا۔ "ہم خود آپ کا ہاتھ بٹانے کی غرض سے آئے ہیں۔"

"نہیں بھتی نہیں.... تم آرام کرو۔" نواب صاحب نے پرخیال انداز میں کہا۔ "اوہ.... ٹھیک یاد آیا۔ تم ابھی تک لڑکیوں سے نہیں ملے۔ آؤ.... آؤ.... میں کچھ اتنا زیادہ مشغول رہا کہ ان سے تمہارا تذکرہ تک نہ کر سکا۔ مخلیلہ تمہاری بہت ملاح ہے۔ تمہارے بھتیرے کیوں کی روپرٹوں کے تراشے اس نے اکٹھے کئے ہیں۔ اکثر کہتی ہے کہ بہت خوفناک آدمی ہوں گے۔ ہمیں تمہاری مسکین صورت دیکھ کر اسے بڑی مایوسی ہو گی۔"

جید پہنچنے لگا۔ لیکن پھر دھما سمجھیدہ ہو گیا۔ غالباً اسے پچھلی رات والی لڑکی یاد آگئی تھی۔

فریدی نے اس کے کانہ سے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم اشرف وغیرہ کا خیال رکھنا۔ انہوں نے بھی ابھی ناشتہ نہ کیا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“ حید کی جان میں جان آئی۔ ”مجھے انہیں کے ساتھ رہنا چاہئے۔“ ہم نے ہی تو انہیں شکار کی لئے مدعا کیا تھا۔ انہیں اکیلا چھوڑنا مناسب نہیں۔“

فریدی کے ہونوں پر تمسخر آمیز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور حید اس کا مطلب سمجھ کر جیپ کیا۔ نواب صاحب فریدی کا ہاتھ پکڑ کر برآمدے کی طرف مڑے اور حید اپنے ساتھیوں کے کروں کی طرف چل دیا۔

راہ میں صولت مرزا نے ایک نوکر کو روک کر لڑکیوں کے متعلق پوچھا۔ اس نے بتایا کہ وہ ڈائینگ روم میں ہیں۔

”ارے بھی شہریوں کو ناشتہ پہنچایا نہیں۔“

”بھی ہاں۔“ نوکر نے جواب دیا۔ ”اور آپ لوگوں کے متعلق آپ سے پوچھنا تھا۔“ ”میرے خیال سے تواب ڈاکٹر کو کھانے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“ صولت مرزا نے فریدی سے پوچھا۔

”قطیعی نہیں..... میرے خیال سے رات ہی کسی خاص پرہیز کی ضرورت نہیں تھی۔“

”خیر آؤ بھی۔“ صولت مرزا نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

متعدد کروں سے گزرتے ہوئے وہ ڈائینگ روم میں آئے جہاں رات والی دونوں لڑکیاں اور تیری عورت بیٹھی تھی۔ کچھ بیچے بھی تھے۔ وہ سب انہیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے۔

”لو بھی تکلیف.....!“ صولت مرزا نے چھوٹی لڑکی کو مخاطب کیا۔ ”تمہیں ایک بہت ہی خوفناک آدمی ملا ڈا۔“

تینوں مستضرانہ انداز میں فریدی کی طرف دیکھنے لگیں۔

”انپکڑ احمد کمال فریدی۔“ صولت مرزا نے کہا۔

”اے.....!“ تکلیف کے منہ سے بے اختیار لکھا اور صولت مرزا ہنسنے لگے۔

”تم بھی تھیں یہا خوفناک آدمی ہو گا؟ بیٹھو بھی بیٹھو۔“ اس نے فریدی کے کانہ سے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ تکلیف ہے۔ یہ جملہ اور یہ عقیلہ!“

فریدی کی توجہ کا مرکز زیادہ تر بھلی لڑکی جیل بنی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کے چہرے ساف ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ حد درجہ چوچڑی ہے، ہونٹ سکرے ہوئے تھے۔ ابروؤں کے درمیان ایک ابھری ہوئی تھکن تھی جو اس کے مچھے ہزار کی غلابی کر رہی تھی۔ ابروؤں میں ایک خاص قسم کا ناٹھ تھا: س کا خوش ہزاں سے دور کا بھی لگاؤ نہیں معلوم ہوتا تھا.... لیکن..... فریدی سوچ میں پڑ گیا۔ بھلی رات کو تو اس کے چہرے کے خطوط بڑے دلاؤں معلوم ہو رہے تھے، سبک اور حسین ہو نئوں پر ایک عجیب قسم کی نشانگیز قصر تراہت تھی۔ مانتے پر وہ بد نہ ماسلوٹ بھی نہیں تھی۔ ابروؤں میں مچھے پن کا شایبہ بھی نہیں تھا۔

"تو یہ دی کمال میاں ہیں، جو عزیز بچپنا کے ساتھ آیا کرتے تھے۔" بڑی لڑکی عقیلہ بولی۔

"مجھے افسوس ہے کہ بھپن کی بہتری باتمیں یاد نہیں رہ گئیں۔" فریدی نے کہا۔

"اس کی شکایت ہی نہیں۔ زمانہ ہی نہ جانے کہاں سے کہاں جا پہنچا۔" عقیلہ اس کی طرف چائے کی پیالی اور چوشیوں کی طشتی کھسکاتی ہوئی بولی۔ "جب تک عزیز بچپنا نہ رہے براءہ آتا جانا، اس کے بعد سلسلہ ہی قسم ہو گیا۔ اللہ بنخشنے عزیز بچپنا بھی بڑی خوبیوں کے بزرگ تھے۔"

فریدی کا دم کھٹک لگا۔ اسے گھر بڑو قسم کی باتوں سے اختلاج ہونے لگتا تھا۔

عقیلہ اپنی چھوٹی بہن کو مخاطب کر کے بولی۔ "اور سنو! عزیز بچپنا نے انہیں بارہ سال کی عمر میں انگلیڈ بھیج دیا تھا اور پھر دس سال تک ان کی محل نہیں دیکھی۔ حکم تھا کہ ایم۔ اے پاس کرنے سے قتل ہندوستان نہیں آئتے۔" پھر وہ فریدی سے پوچھنے لگی۔ "آخر تھمیں اس انپکٹری میں کیا مزامنہ ہے اول تو میرے خیال سے تمہیں ملازمت کی ضرورت ہی نہیں تھی اور اگر کرنی ہی تھی تو کسی بڑی جگہ پر کئے ہوتے اتنی تعریفیں تمہاری اخبارات میں صحیح رہتی ہیں اور ابھی تک وہی انپکٹر کے انپکٹر۔"

فریدی پہنچنے لگا۔

"بات یہ نہیں۔" اس نے چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ "میں دراصل اپنی ہی ضد کی وجہ سے اب تک انپکٹر ہوں، بڑے عہدے حاصل کر لینے کے بعد کام کا موقع نہیں ملتا۔"

"بانکل وہی عزیز بچپنا کی ہی باتمیں۔" عقیلہ مسکرا کر بولی اور صیولت مرزا کی طرف دیکھنے لگی۔ "نگیک ہے وہ حضرت بھی آئے دن ایک نئے خط میں جلا رہے تھے۔ کبھی جزوی بھجوڑا۔

تشریف لے جا رہے ہیں۔ ربڑ کی کاشت کی تربیت حاصل کرنے کے لئے اور کبھی مصر اور وجہ پوچھو تو مسکرا کر کہیں گے کیوں نہ ایک بار اہرام مصر کی زیارت کر لی جائے۔ اچھا بھی اب تم لوگ بننے میں تو چلا۔"

صوت مرزا چلا گیا۔ فریدی بار بار جیلہ کی طرف دیکھ لیتا تھا جو ان باتوں میں کوئی دلچسپی نہیں لے رہی تھی۔ البتہ مکملہ اسے کبھی کبھی پر اشتیاق انداز میں دیکھنے لگی تھی۔ ایسا معلوم ہوا رہا تھا مجھے وہ بھی اس سے گلکلو کرنے کے لئے بے چین ہے۔

تحوڑی دیر کے لئے خاموشی چھا گئی۔ جیلہ کچھ آتائی سی نظر آرہی تھی۔ آخر وہ انٹھ کر چلی گئی۔

"تمہارے زخموں کا اب کیا حال ہے۔" عقیلہ نے پوچھا۔ "مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ تم ہو۔ ابا جان کو اتنا ہوش ہی نہیں تھا کہ وہ کچھ بتاتے۔ آخر تم یہ راج گھر ہی کی طرف کیوں چلے گئے تھے۔ تو کروں نے شاید تمہارے آدمیوں سے ساتھا کہ تم اس شیطانی کے کاپڑے لگانے گے تھے۔" "بات تو یہی تھی۔" فریدی مسکرا کر بولا۔

"تو تم اسی طرح اپنی جان ہٹھلی پر لئے پھرتے ہو۔"

"ویسے میں بڑا ذرپوک آدی ہوں لیکن المکی باتوں کا پڑھ لگانے کو دل چاہتا ہے۔" فریدی نے سگار نکالنے ہوئے کہا۔ "اگر میں یہاں سگار پیوں تو کوئی ہرج تو نہیں۔"

"بھلا اس میں ہرج کی کیا بات۔" عقیلہ مکملہ کی طرف دیکھ کر معنی خیز انداز میں مسکرائی۔ "شکریہ۔" فریدی سگار کا کونہ توڑ کر اسے ہونٹوں میں دباتا ہوا بولا۔ وہ تحوڑی دیر تک کچھ سوچتا رہا پھر یہک کہنے لگا۔ "جیلہ صاحب نے کچھ رات مجھے ڈرایا تھا۔ بہر حال میں اس مذاق سے دیر تک محفوظ ہو تا رہا۔"

"مذاق۔" دفتار عقیلہ کے چہرے پر ادای کی گھری جہیں جم گئیں۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ "مذاق نہیں تھا۔"

"مذاق نہیں تھا۔" فریدی کے لبھ میں معنوی حرمت تھی۔

"مذاق نہیں تھا۔" عقیلہ دیرے سے بولی۔ "یہ ہماری ایک پرانی بد نسبتی ہے اس پر گیارہ سال کی عمر سے اس قسم کے دورے پڑتے ہیں۔"

”دورے....!“

”ہاں دورے.... وہ اپنے ہوش میں نہیں ہوتی تھی۔ لیکن اب تو یہ حال ہے کہ قبے کے ایک ایک فرد کو اس کی اطلاع ہو گئی ہے۔“

”یہ دورے پڑتے کس طرح سے ہیں۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں پوچھا۔ ”بس سوتے سوتے انھے پہنچتی ہے اور اس حتم کی باتیں کرنے لگتی ہے جیسی تم کچھلی رات سن پکھے ہو۔“

”اور انہیں اپنی کچھلی زندگی بالکل یاد نہیں رہتی۔“ فریدی نے پوچھا۔

”ہاں.... وہ سب کچھ بھول جاتی ہے۔ ہم سے کہتی ہے کہ تم نے مجھے کیوں قید کر رکھا ہے۔“

”اور پھر وہ اسی حالت میں دوبارہ سوئے بغیر ہوش میں نہ آتی ہوں گی۔“ فریدی نے کہا۔

”کیوں؟ کیا تم اس مرض کے بارے میں کچھ جانتے ہو۔“

”یو نہیں تھوڑا بہت! علاج کس حتم کا ہو تارہ۔“

”سب کچھ کرتے تھک گئے ہیں۔ ملک کے نامور ڈاکٹروں سے مشورے لئے گئے۔ لیکن سب ہی اس بات پر تفہیق ہیں کہ جب تک مرض کی وجہ نہ معلوم ہو مرض لا علاج ہے۔ بھلا جاتا ہو، ہم اس کی وجہ کیا جائیں۔“

”ہوں....!“ فریدی کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”یہ ایک ذہنی مرض ہے وہ یا تو خود بخود جائے گا یا پھر.... کیا ان کی شادی ہو گئی ہے۔“

”نہیں.... اور سبھی ہماری سب سے بڑی بد نصیبی ہے۔ یہ بات سارے اعزہ میں مشہور ہو گئی ہے کہ جیلی پر جن آتے ہیں۔ لہذا انہیں سے بات ہی نہیں آتی۔“

”مجھے آپ لوگوں سے ہمدردی ہے۔“ فریدی متاسفانہ انداز میں بولا۔ ”کیا آپ بتا سکتی ہیں کہ وہ کس حتم کی کتابیں پڑھتی ہیں۔“

”اگریزی کی موٹی موٹی کتابیں۔ مجھے تو اگریزی آتی نہیں۔ اس نے ایف اے تک پڑھا ہے۔ وہ دون بھر لا بھریری میں کھسی رہتی ہے۔ اس وقت بھی وہیں کسی موٹی سی کتاب میں ڈوبی ہوئی ہو گی۔“

فریدی کچھ کہنے ہی جا رہا تھا کہ عقیلہ کا دس سالہ لڑکا جاوید بگل بجا تا ہوا گھس آیا۔

”جادید یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ عقیلہ نے اسے ڈائیل

”می...!“ ہم مارچ کر رہے ہیں۔ لفٹ رائٹ... لفٹ رائٹ۔ لفٹ رائٹ وہ زمین پر جیر
مارنے لگا۔

”شکلیدہ ذرا پکڑ... اس سور کو۔“

جادید بگل بجا تاہوا باہر گیا۔

”می...! ہم بھی بگل لیں گے۔“ ایک پانچ سالہ بچی اس پر لد کر نہ کھنے لگی۔

”غصہ و راتنی ہے کہ ابا جان بھی اس سے دبجتے ہیں۔“ عقیلہ رازدارانہ انداز میں بولی۔

”ورنہ ڈاکنزوں نے اسے پڑھنے لکھنے کے لئے منع کر رکھا ہے وہ کسی کی سنتی ہی نہیں۔“

”می ہم بھی بگل لیں گے۔“ لڑکی پھر منتنائی۔

”کھا جاؤ تم لوگ مجھے۔“ عقیلہ جلا کر بولی۔ ”چلو ادھر ہنو... لڑکیاں بگل نہیں بجا تیں۔

جادید تو بھی گڑیوں کے لئے خند نہیں کرتا۔ ہاں تو۔“ وہ پھر فریدی کی طرف مخاطب ہو گئی۔ مگر بڑی حرمت کی بات ہے کہ نہ تو اسے ہوش کی حالت میں دورے کی باتیں یاد رہتی ہیں اور نہ دورے میں ہوش کی حالت کی باتیں۔

”می بگل...!“

”شکلیدہ اسے لے جاؤ... ورنہ پیٹ کر رکھ دوں گی۔“ عقیلہ نے بچی کو پرے دھکلتے ہوئے کہا اور پھر فریدی سے بولی۔ ”میری تو سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا کیا حشر ہو گا۔ دورے کی حالت میں ایسی ایسی باتیں ا جان کو کہتی ہے کہ تم ظالمِ رومنوں کے غلام ہو۔ مجھے آزاو کر دو۔ ورنہ تمہارے محل کی اینہ سے ایسٹ نج جائے گی۔ مصری حکومت تمہیں اپنے شکاری کتوں سے نجواؤ لیں گے۔“

فریدی سوچ رہا تھا کہ اس بھلی عورت سے کس طرح پیچا چڑائے۔ اس کی باتیں کسی کام کی نہیں معلوم ہوتی تھیں۔ ایک کے بعد دوسری اور دوسری کے بعد تیری... جو باتیں اس نے کرنی چاہی تھیں ان کی طرف سے اس نے لا علیٰ ظاہر کی تھی۔ لہذا اب غیر متعلق باتوں میں الجھ کرو وہ وقت برپا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے رات ہی کو سوچ لیا تھا آج بھی یہ راج گڑھی کا ایک آدھ چکر ضرور لگائے گا۔ وہ اس کے کاراز معلوم کرنے کے لئے نبی طرح بے چین تھا کہ کسی

طرح نکل بھاگے۔ اچانک صولت مرزا کی آواز سنائی دی۔

”آؤ بھی فریدی تمہیں ایک دلچسپ آدمی سے ملاوں۔“

صولت مرزا دروازے میں کھڑا عقیلہ کو گھور رہا تھا۔ فریدی اٹھ کر اس کے قریب آیا اور پھر دونوں نشست کے کمرے میں پڑے گئے۔

حکیم ارسلانوس

ڈر انگر روم میں اسے ایک قطعی غیر دلچسپ آدمی دکھائی دیا، جو ایک صوفے پر اکڑوں بینخا اونگ رہا تھا۔ بھورے رنگ کی گھوٹکھریاں دلائلی اور سر پر بالوں کا ایک بے ہنجم سا گچھا تھا۔ وہ بھی کچھ اس قسم کا کہ بھوکی گائیں اسے خلک گھاس سمجھ کر بے خیالی میں اس پر ایک آدھ بار منہ ضرور مبارکتی تھیں۔ ان کی آہٹ پر وہ چونکا اور نیم باز آنکھوں سے دیکھ کر پھر اونگختے لگا۔ لیکن اس کی یہ حالت دیر تک قائم رہی۔ جیسے ہی وہ صوفے پر کھڑا ہو گیا۔

”میاں صولت اب پانی سر سے اوپنچا ہو گیا ہے وہ یار ذرا دیکھو تو ہم صاحب کا لوتا مجھے چوچی دکھاتا ہے۔“ قسم ہے اللہ کی نہ جانے کیا سمجھ کر چھوڑ دیتا ہوں اور جو ہم صاحب سے شکایت کیجئے تو وہ بھاڑ سامنہ کھول کر کہہ دیتے ہیں کہ پچھے ہے.... ہو گا پچھ وچہ۔ میاں جس دن غصہ آگیا زمین و آسمان کے قلا بے ملا کر رکھ دوں گا۔“

”ضرور ضرور بھائی صاحب۔“ صولت مرزا سنجیدگی سے بولا۔ ”ان سے ملتے یہ ہیں اپنے نواب عزیز الدین خاں کے صاحبزادے احمد کمال فریدی اور آپ حکیم ارسلانوس.... بڑے پائے کے حکیم ہیں۔“

”ماں وہی عزیز الدین خاں ناجنہوں نے راجہ سانگر کے پاکل ہاتھی کو گولی مار دی تھی۔“ اس نے پوچھا۔

”وہی وہی!“

”اچھا تو آؤ میاں بنیھو۔“ وہ ایک طرف سر کرتا ہوا بولا۔ ”یہ تمہارے سر پر پٹی کیسی بندھی ہو گئی ہے۔“

”چوت آئی ہے۔“ فریدی نے سعادت مندی سے کہا اور اس کے قریب ہی بیٹھے گیا۔ صولت مرزا دوسرے صوفے پر نمک گیل۔ ”کیا لگایا ہے۔“

”معلوم نہیں۔ میری بے ہوشی کی حالت میں ڈاکٹر نے بینڈج کی تھی۔“ ”بینڈج کیا؟“

”یعنی کہ پئی باندھی تھی۔“

”تو گویا انگریزی میں پئی باندھی۔“ اس نے ایک شخص ناتا ہوا تھہہ لگایا۔

”ارے میاں گومی باندھ گوی۔ ایک دن میں زخم بھر جائیں گے۔“ ”گومی کیا۔“

”ہاا..... پوچھتے ہیں۔ گومی کیا۔ بھی صولت تمہیں بتاؤ گومی کیا جائز ہے۔“

”بھلا میں کیا جاؤں۔“ صولت مرزا مسکرا کر بولا۔

”پہلو تم بھی یونہی نکلے۔ ارے میاں گومی ایک بوٹی ہے جس کی ہر چار پیوں کے اوپر سبز رنگ کی ایک گیند ہوتی ہے۔ اس میں بے شمار سوراخ سے سفید رنگ کا ایک پھول نکلا ہے۔ ابھی چلو میں تمہیں یہ بوٹی پہنچوادوں۔ سونے کے بھاؤ بکنے والی بوٹی ہے۔ کیا سمجھے۔“

وہ اور نہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ وقت فریدی کی نظر پشت کی طرف اٹھ گئی۔ عقیلہ کا لڑکا ہاتھ میں بگل لئے کھڑا تھا۔ اس نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر فریدی کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ صولت مرزا بھی آڑ میں تھے۔ جاوید آہستہ آہستہ انہا بگل حکیم ارسلانوس کے کان کے قریب لا لایا اور پھر زور کی پھونک ماری وہ چیز کراچپل چڑا۔ لیکن قبل اس کے کردہ پلٹتا جاوید کرے سے جا چکا تھا۔ صولت مرزا بھی گڑ بدا کر کھڑا ہو گیا۔ اسکے چہرے پر سمجھی گی سے لپٹی ہوئی شرمندگی کے آثار تھے۔ حکیم ارسلانوس صوفے سے جست لگا کر فرش پر آیا اور صولت مرزا کو مکا دکھا کر کہنے لگا۔

”میں سب سمجھتا ہوں۔ یہ عقیلہ کے لوٹے کی شرارت ہے۔ میں نے اس کے ہاتھ میں بگل دیکھا تھا۔ خیر سمجھ لوں گا۔“

”ارے بھائی صاحب آپ ہی نے تو لڑکوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔“ مرزانے پر ٹکایت لجھ میں کہا۔

”کیا تو لڑکوں کو لڑکا ہی رہنا چاہئے۔ دادا نہ بن جانا چاہئے۔ خیر خرد کیجھ لوں گا۔“

”اُرے تو چلنے کہیں بیٹھنے تا۔“ صولات مرزا نے کہا۔

”جی نہیں۔ میں اُلوں نہیں ہوں۔ مرنے کے بعد میری قدر معلوم ہو گی۔ میاں بُوناں میں پیدا ہوا ہوتا تو لوگ میرے بت بنا کر پوچھتے۔“

مرزا بار و کتابی رہا۔ لیکن ارسلانوس اٹھ کر چلا گیا۔

”آپ نے کیا نام بتایا تھا ان کا۔“ فریدی نے پوچھا۔ صولات مرزا ہنسنے لگا۔

”نام تو محمد حسین ہے لیکن یہ خود کو حکیم ارسلانوس کہلواتے ہیں۔“ صولات مرزا نے کہا۔

”یونانی علوم کے مطالعے نے ان کا دماغ اٹ دیا۔ خاص طور پر قلسہ ان کا پسندیدہ شخصون رہا ہے۔

تحصیلوں سے لے کر ارسطو نک شاید ہی کوئی ایسا فلسفی ہو جس کے کارناموں کا انہوں نے گیق

مطالعہ نہ کیا ہو۔ کلینیوں نے انہیں خاص طور پر ممتاز کیا ہے۔“

فریدی کے ماتحت پر سلوٹیں ابھر آئیں۔

”آپ کی لاپبریری بھی بڑی شاندار ہو گی۔“ اس نے کہا۔ ”اکثر والد صاحب کی زبانی اس

کا تذکرہ سن چکا ہوں۔“

”شاندار کیا۔ ہاں کتابیں کافی ہیں۔ میں نے عمر سے سے ادھر کارخ بھی نہیں کیا۔ نہ جانے

یہ کیا بات ہے کہ اب پڑھنے پڑھانے میں دل ہی نہیں لگتا۔ صرف جیل فرمت کے لمحات میں

زیادہ تر وہیں تھی رہتی ہیں۔“

”آپ نے انہیں کسی سائیکو ایٹلٹ کو نہیں دکھایا۔“ فریدی نے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

صولات مرزا بے اختیار چوک چوک پڑا۔

”اب بھی اندر سیکی بات ہو رہی تھی۔“ فریدی نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا ”وہ

در اصل کچھلی رات کو دورے کی حالت میں ہمارے کرے میں آگئی تھیں۔ اس گنگوہ سے قتل میں

یہ سمجھتا رہا کہ شاید انہوں نے مذاق کیا تھا۔“

”اب کیا بتاؤں۔“ صولات مرزا مشتعل آواز میں بولا۔ ”اس کی فکر مجھے گھن کی طرح کھائے

جاری ہے۔ پہلے تو خیر دورے ہی پڑتے تھے گر.... ادھر کئی دنوں سے اب کیا بتاؤں۔

میرے علاوہ شاید ابھی گھر کا کوئی اور فرد نہیں جانتا۔“

ابھی بات سمجھیں تک پہنچی تھی کہ باہر کچھ شور سنائی دیا۔ بگل کی پے در پے آوازوں کے ساتھ ہی کسی پہنچ کی تجھیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ یہ دونوں گھبر اکر برآمدے میں نکل آئے۔ ارسلانوس جاؤید کو اپنی گرفت میں جکڑ کر اس کے کان سے بگل لگائے پھونگوں پر پھونگیں مار رہا تھا۔ بمشکل تمام انہوں نے اسے چھڑایا اور صولت مرزا نے جایید کو بھرپور چاند سید کیا۔ وہ روتا ہوا اندر بھاگ گیا۔

”آپ بھی بچوں کے ساتھ پہنچے بن جاتے ہیں۔“ صولت مرزا کے لبھ میں صحبت ہاٹھ تھی۔ ”تمہارا یہ چانٹا میری گال پر پڑا ہے۔ اسے یاد رکھنا۔“ ارسلانوس سرد لبھ میں بولا۔ ”آپ کے گال پر“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”مگر فواب صاحب نے پہنچ کو مارا ہے۔“ ”غصہ تو مجھ پر آیا تھا۔“ ارسلانوس بولا۔ ”لہذا وہ تپڑ دراصل میرے ہی گال پر پڑا ہے۔“ صولت مرزا اندر چلا گیا۔ ارسلانوس کے گرد فریدی کے دوست اکشہا ہو گئے تھے۔ ان میں سے خصوصاً سرجنت حمید ارسلانوس کو بڑی توجہ اور دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”کیوں صاحب کیا میں تماش ہوں۔“ ارسلانوس انہیں مخاطب کر کے بولا۔ ”جی ہاں!“ حمید سنجیدگی سے بولا۔ ”اور میں یہ سوچ رہا ہوں کہ اس تماشے کے پیسے کون وصول پکرے گا۔“

”میکا بکواس ہے۔“ ارسلانوس بحثا کر بولا۔ ”تم ہے اللہ کی.... اگر اس قبیلے کے ہوتے تو ناقہ بند کر دیتے۔“

”حمد کیا بیہودگی ہے۔“ فریدی نے اسے ڈائل۔ پھر حکیم ارسلانوس کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”حکیم صاحب! میں آپ کے رتبے سے واقف ہوں۔ ملک میں کوئی آپ کی گلر کا نہیں۔ میں دل سے آپ کی قدر کرتا ہوں۔“

”واللہ تم مومن ہو۔“ ارسلانوس پر جوش انداز میں اس کا شانہ چھکتا ہوا بولا۔

”اور میرے لئے کیا ارشاد ہوتا ہے جتاب۔“ حمید آگے بڑھ کر بولا۔ ”وجا۔“

”تو بس ایمان لے آئیے مجھ پر“ حمید نے سنجیدگی سے کہا۔ ”ورنہ آرے سے چڑا کر دوبارہ زندہ کر دوں گا۔“

”تم ہے اللہ کی بیججا پھاڑوں گا۔“ ارسلانوس اس کی طرف پکد لیکن فریدی تھی میں آگیا۔

”جانے بھی دیجئے حکیم صاحب.... بچوں کو معاف کر دیتے ہیں۔“

”یہ بچہ ہے! اگر بچہ ہے تو اپنی ماں کا دودھ پی کر دکھائے۔“ ارسلانوس گر جاد۔

”ابے او بلند وس.... زبان سنجال کے۔“ حمید بھی آگے بڑھا۔

”بلند وس....!“ اس نے بچوں کی طرح تھہہ لگا کر کہا۔ جاہل کہیں کے۔ یونان میں کوئی

بڑا آدمی بلند وس نام کا نہیں گزرا۔ تم بھول رہے ہو۔ شاید تمہاری مراد جانلوس سے ہے۔“

”حید....!“ فریدی نے اُسے پھر ڈانتا اور حمید نے خاموشی اختیار کر لی۔

فریدی اسے اوہر اور ہر کی باتوں میں لگا کر چھانک تک چھوڑ آیا اور ارسلانوس اسے اپنے گھر آنے کی دعوت دے کر خست ہو گیا۔

”یہ کون جنگلی تھا۔“ حمید نے فریدی سے پوچھا۔

”ایک خبٹی۔“ فریدی نے کہا اور اس کے متعلق اسے جو کچھ معلوم تھا بتا دیا۔

”آدمی اس قابل ہے کہ اسے دلچسپی کا مشغله بنایا جاسکے۔“ حمید نے کہا۔

ائتح میں اشرف وغیرہ بھی آگئے اور فریدی پر اسی وقت یہاں سے روانہ ہو جانے پر زور ڈالنے لگے۔ لیکن فریدی کچھ اور سوچ رہا تھا۔ وہ کچھلی رات کو یوں ہی بلا مقصد خطرے میں نہیں پڑا تھا۔ اس نے فی الحال یہ کہہ کر انہیں خاموش کر دیا کہ وہ صولات مرزا سے مشورہ لئے بغیر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ وہ ان کا مہمان خصوصی تھا۔

یہ بحث ہو رہی تھی کہ ایک نو کرنے آگر فریدی سے کہا۔

”سرکار آپ کو لا بھری ہی میں یاد کر رہے ہیں۔“

فریدی حید کو رکنے کا اشارہ کر کے اس کے ساتھ چلا گیا۔ صولات مرزا کی اوہ سوری بات رہ رہ کر ذہن میں چھوڑ رہی تھی۔ وہ کون ہی بات تھی جس کے متعلق اس کے علاوہ گھر کے کسی فرد کو علم نہیں تھا۔

لا بھری میں اسے جیلہ بھی دکھائی دی جو ایک گوشے میں محلی کھڑکی کے قریب باب کی طرف پشت کے نہیں تھی۔ یہ ایک کافی طویل و عریض کرہ تھا۔ چاروں طرف بڑی بڑی الماریاں تھیں، جن میں کتابیں چنی ہوئی تھیں۔ درمیان میں ایک بڑی میز تھی جس کے گرد گدے دار

کر سیاں تھیں۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹی چھوٹی میزیں اور تھیں۔ بہر حال وہ سارا فرنچر موجود تھا جو کسی جدید طرز کے ریٹیلگ روم کے لئے ضروری ہو سکتا ہے۔ فریدی کی آہت پر جیلے چوپک کر مڑی اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کے چہرے کا تینھا پن کچھ اور واضح ہو گیا تھا۔ فریدی اسے سکھیوں سے دیکھتا ہوا صولت مرزا کی طرف متوجہ ہو گیا، جو ایک صوفے پر نیم دراز کسی کتاب پر گرد پوش چڑھا رہا تھا۔

جیلے نے ہاتھ میں دبی ہوئی کتاب الماری میں رکھ دی اور باہر چل گئی۔ فریدی نے وہ جگہ نوٹ کی جگہ کتاب رکھی گئی تھی اور ادھر ادھر دیکھ کر بولا۔
 ”واقعی شاندار ہے۔ اگر اجازت ہو تو میں ایک نظر ڈال لوں۔“
 ”ضرور بھی ضرور۔“ صولت مرزا اٹھتا ہوا بولا۔

فریدی ایک ایک الماری کا جائزہ لیتا ہوا اس الماری کے قریب آیا جس میں جیلے نے کتاب رکھی تھی۔ اس دوران میں صولت مرزا اسے جیلے کے متعلق بتا رہا تھا۔ فریدی نے وہ کتاب الماری سے نکالی اور ورق گردانی کرنے لگا۔ وھنہاں اس کے ہوننوں پر ایک عجیب قسم کی مسکراہٹ بھیل گئی۔ صولت مرزا کہہ رہا تھا۔ ”اب ایک بالکل ہی نئی بات ہونے لگی ہے جس کا مطلب میری سمجھ میں نہیں آتا۔ سخت ابھمن میں ہوں کہ تم اس طرح غیر متوقع طور پر ادھر آئٹے۔“

فریدی میز پر کتاب رکھ کر استفہامیہ انداز میں صولت مرزا کی طرف دیکھنے لگا۔
 ”ممکن ہے کہ تم نے چھپلی رات کو اندازہ لگایا ہو کہ وہ زیادہ تر قدیم یوتان روم اور مصر کی بائیں کرتی ہے۔“

”اطھری اور میں اسی کے متعلق سوچتا بھی رہا ہوں۔ اس وقت وہ مسئلہ بھی حل ہو گیا۔“
 ”میا...!“ صولت مرزا نے پر اشتیاق لبھے میں پوچھا۔
 ”تو کچھ وہ دن بھر پڑھتی ہیں وہی دورے کی حالت میں ان کی زبان پر ہوتا ہے۔“ فریدی نے کہا۔

”ٹھیک ہے وہ زیادہ تر روم.... یوتان اور مصر کی قدیم تاریخ کا مطالعہ کرتی ہے، لیکن دوسرا بات....!“

صولت مرزا دفعہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے پر شدید ابھمن کے آثار پیدا ہو گئے تھے۔

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ اس کیلئے یا تو مناسب الفاظ حلاش کر رہا ہے یا پھر کہنے ہی میں اسے تامل ہے۔ فریدی میر کے کونے پر نک کر پر خیال انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”بھتی کسی طرح کہوں زبان نہیں بھلتی۔“ صولات مرزا نے خود سے آتا کر کہا۔

”اگر کوئی اہم بات ہے تو ضرور بتائیے۔ وہ مجھ تک ہی محدود رہے گی۔“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”اہم سے بھی زیادہ ہے۔ لیکن تم مجھے کیا سمجھو گے۔“

فریدی پھر اسے عجیب نظروں سے دیکھنے لگا۔ دراصل اشتیاق کے ساتھ ہی ساتھ آتا ہے بھتی اس کے ذہن کے کسی گوشے سے ابھر رہی تھی۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ اس نے کہا۔

”بھتی اگر تم رات کو اپنے یہاں کچھ اجنبیوں کو دیکھو اور ان کا کچھ بنایا گاڑنہ سکو تو لوگ تمہیں کیا کہیں گے۔“ صولات مرزا نے بے ڈھنگے پن کے ساتھ کہا۔

”پیدا یا بزدل.....!“ فریدی مسکرا کر بولا۔

”لیکن..... لیکن..... جن حالات میں مجھے اس قسم کا انتقام ہوا ہے.....!“

”آپ کو.....!“

”ابھی تک ہم سب اسے ایک ذہنی پیداری ہی سمجھتے رہے ہیں۔“ صولات مرزا کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”مگر ادھر کچھ دنوں سے.....!“ وہ پھر کہتے کہتے رک گیا اور فریدی کو ایک بار پھر جھنگھلاہٹ کو دبا کر چھرے پر زندگی کے آثار پیدا کرنے پڑے۔

”میں اپنے گھر میں کئی راتوں سے کچھ اجنبیوں کو دیکھ رہا ہوں۔“ صولات مرزا نے گلاصاف کرتے ہوئے کہا۔ ”لیکن وہ اس دنیا کے آدمی نہیں معلوم ہوتے۔“

”میں امطلب.....!“ فریدی پوچک کر بولا۔

”وہ اسی دنیا اور اسی زمانے کے آدمی معلوم ہوتے ہیں جس کا تذکرہ جیلہ دورے کی حالت میں کرتی ہے۔“

فریدی تھیرانہ انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا اور صولات مرزا بولتا رہا۔ ”ان کا لباس یوتاں یا روم کے قدیم سپاہیوں کا سا ہوتا ہے۔ سروں پر لوہے کے چکدار خود باتھوں میں نیزے اور مستطیل ڈھالیں ہرگز دن سے کرک زریں۔ ٹھنڈوں سے ٹھنڈوں تک کے ہوئے سیاہ سینڈلوں کے تھے۔“

فریدی نے بے خیالی میں وہ سگار کھڑکی کے باہر پھیلک دیا جو بھی سلکایا تھا۔

”آپ نے انہیں پکڑنے کی کوشش نہیں کی؟“ فریدی نے آہست سے کہا۔

”ای حتم کے سوالات کے خوف سے میں نے اس کا تذکرہ کسی سے نہیں کیا۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”انہیں دیکھ کر خون رکوں میں محمد سا ہوتا معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہ میں اپنے ذاتی تجربے کی بناء پر کہہ رہا ہوں۔ میں انہیں تمن بار دیکھ چکا ہوں ان کے چہروں کے گرد ایک عجیب حشم کی روشنی ہوتی ہے۔ آنکھیں اپنے حلقوں میں جبی جبی سی معلوم ہوتی ہیں اور سب سے زیادہ حرثت انگیز باتیں ہیں کہ وہ اسی وقت دکھائی دیتے ہیں جب جیلہ پر دورہ پڑتا ہے۔“

”تو پھر وہ کل رات کو بھی دکھائی دیتے ہوں گے۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میں کچھ نہیں کہ سکتا کیونکہ کل رات مجھے ہوش نہیں تھا۔“

”تو کیا وہ جیلہ کے پاس آتے ہیں۔“

”ہاں! جیلہ ان سے اس طرح گفتگو کرتی ہے جیسے وہ انہیں جانتی ہو۔“

”کس حشم کی گفتگو۔“

”وہی اوت پنجم جو تم نے پہنچلی رات کو سنی ہوں گی۔ یعنی مجھے یہاں سے رہائی دلاؤ۔

زور س کی فوجیں اب کہاں لڑ رہی ہیں اسے جلد میرے پاس پہنچنا چاہئے۔ وغیرہ وغیرہ۔“

”وہ کیا کہتے ہیں۔“ فریدی نے بے چینی سے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔ ان کے صرف ہوتی ہلتے ہیں۔ آوازیں نہیں نکلتیں، ہاتھوں کے اشارے کرتے ہیں۔ جیلہ کو سارے گھر میں ٹھلاٹے پھرتے ہیں۔ کبھی پائیں باغ میں جاتے ہیں اور کبھی جانوروں کے اصطبل کی طرف..... ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ کوئی چیز علاش کرتے پھر رہے ہیں۔ میں چھپ چھپ کر انکا چیخا کر تارہتا ہوں، لیکن نہ تو اس کی بہت پڑتی ہے کہ فوکروں کو جگاؤں اور نہ سینی کر سکتا ہوں کہ انہیں للاکاروں۔“

”آپ کے چوکیداروں نے تو انہیں دیکھا ہی ہو گا۔“ فریدی نے پوچھا۔

”میرے یہاں کبھی کوئی چوکیدار نہیں رہا۔ نہ میں کہتے پاتا ہوں اور نہ چوکیدار رکھتا ہوں۔

”میں جانتا ہوں کہ نہ تو میرے یہاں چوری ہو سکتی ہے اور نہ ذاکر پڑ سکتا ہے۔“

”ان لوگوں کا جیلہ کے ساتھ کیا رہی ہے۔“

”وہی جو غلاموں کا مالک کے ساتھ ہو سکتا ہے۔“ صولت نے کہا۔ ”وہ اسے دیکھ کر تھیرا جھکتے ہیں۔ اپنے نیزوں کی ایساں زمین پر لیک دیتے ہیں۔ پھر وہ انہیں جنمبوڑتی ہے۔ ان سے اپنے سوالات کا جواب چاہتی ہے لیکن وہ بت بنے کھڑے رہتے ہیں۔ البتہ ان کے ہونٹ بلتے ہیں اور جیلہ پاگلوں کے انداز میں کہتی ہے کہ وہ ان کی آواز کیوں نہیں سن سکتی۔ کیا وہ بہری ہو گئی ہے۔“

”تو آپ نے انہیں بولتے نہیں سن۔“

”نہیں....!“

”اور وہ انداز سے کسی چیز کی علاش میں سرگردان معلوم ہوتے ہیں؟“

”ہاں....!“ صولت مرزا نے جواب دیا۔

”وہ کیا چیز ہو سکتی ہے۔“ فریدی نے پر خیال انداز میں کہا۔

”بھلامیں کیا جاؤں۔“

”خیر.... بہر حال.... آپ نے اس سے کیا نتیجہ اخذ کیا ہے۔“

”بھی کیا جاؤں۔ کچھ کہتے سنتے نہیں بن پڑتی۔ اب سے کچھ دن قبل میں اسے ذہنی یہاری سمجھتا تھا لیکن اب....“ صولت مرزا خاموش ہو گیا۔ چند لمحے بعد وہ فریدی کو غور سے دیکھتا ہوا بولا۔ ”مگر اب یہ سمجھنے پر مجبور ہوں کہ یہ واقعی کوئی آسمی خلل ہے۔“

”شاید آپ ان رو میوں یا یو ناخوں کی بنا پر کہہ رہے ہوں۔“ فریدی نے سکراکر کہا۔

”کیوں؟ کیا تمہاری رائے اس سے مختلف ہے۔“

”ابھی میں نے کوئی رائے قائم نہیں کی۔“ فریدی سگار سلاکا تا ہوا بولا۔

”لیکن مجھے اس قسم کے بھوتوں اور پرتوں کا بارہا تجوہ ہو چکا ہے اور میری نظر وہیں میں ان کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی۔ مثلاً ایک تو وہی آپ کا رد ایتی کتا۔ اگر اپاک دیوار نہ گرفڑی ہوتی تو۔“

دوسری ملاقات

شام بڑی خونگوار تھی۔ دن بھر کی تیز دھوپ کے بعد شفق کی چھاؤں زندگی افروز معلوم ہو رہی تھی۔ مطلع صاف تھا۔ اگر گزر ہوں اور تالا بیوں میں کچڑا اور پانی نہ ہوتا تو یہ کہنا دشوار تھا کہ

ایک دن قبل اعدال سے زیادہ بارش ہو چکی ہے۔ فریدی کے سارے دوست اور نوکر جاچکے تھے۔ حمید نے بھی واپس جانے کے لئے بڑا ذرمان اتحا لکھنٹری یہی کے آگے ایک نہ چلی۔ اسے عجیب و غریب کئے کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کا اشتیاق ضرور تھا لیکن وہ خواہ خواہ خطرے میں نہیں پڑتا چاہتا تھا۔ دوسرے لوگوں سے چھان میں کے بعد اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ اس دنیا کی چیز نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ جو آواز صدہ باسال سے سنی جاتی ہو اس کے لئے سر ما نا ہماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس سے پہلے بھی سینکڑوں جوان مردوں نے اس راز سے پرداہ اٹھانے کی کوشش کی ہو گی۔ خود نواب صولت مرزا سے اسے معلوم ہوا تھا کہ ایک بار چند انگریز اس منارے پر چڑھے تھے اور انہوں نے کافی دنوں تک اور ہر اور ہر ہاتھ پر بھی مارے لیکن کوئی قاعدے کی بات نہ معلوم ہو سکی اور پھر منار کا دروازہ ہی بند کر دیا گیا۔ چونکہ اس گھر میں کو ہماری بھی اہمیت حاصل تھی اس لئے اکثر آثار قدیمہ سے دلچسپی رکھنے والے اسے دیکھنے کے لئے آتے رہتے تھے اور ایک بار تو اس کی کھدائی بھی ہوئی تھی۔

حمد کرتا بھی کیا۔ ہاتھ پر مارنے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا اور اس کا انجام بھی خود اس کے ہاتھوں میں نہیں تھا۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ فریدی اپنا اطمینان کے بغیر یہاں سے نہیں جا سکتا۔ اس وقت وہ دونوں کو خی کے عقی پارک میں بیٹھے شفقت میں تحمل ہوتی ہوئی سرخیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ حمید کو حیرت ہو رہی تھی کہ صولت مرزا اس قبیلے میں رہ کر کس طرح اعلیٰ معیار کی زندگی بسر کر رہا ہے، اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ انگلینڈ کے کسی بڑے آدمی کے خالی گلی پارک میں بیٹھا ہو۔ یہاں لان پر کئی جگہ قد آدم بھی نصب تھے۔ فن میں زیادہ تر یونان و روم کی قدیم سنگ تراشی کے نمونے تھے۔ جنمیں موجودہ رور کے اچھے فنکاروں نے تراشنا تھا۔

”صولت مرزا کو بھی شاید مردہ تہذیبوں سے بڑی دلچسپی ہے۔“ فریدی نے کہا۔

غائباؤہ دونوں بیک وقت ایک ہی بات سوچ رہے تھے۔

”ہوں.....!“ حمید نے پر خیال انداز میں گزدن ہائی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ بڑی دیر سے خود کو پوز کر رہا تھا۔ ورنہ خصوصیت سے آج کے دن اسے فریدی کی ساری باتیں زہر لگ رہی تھیں۔ ”اب اگر اس سلسلے میں اس کی بیٹی کا داماغ الٹ جائے تو یہ تعجب کی بات نہیں۔“ فریدی نے سگار لگاتے ہوئے کہا اور پھر حمید کی طرف دیکھنے لگا۔

"ہو گا.... ہو گا.... مجھے کیا؟" حید پیراری سے بولا۔

"اے ہزاروں سال کے مردے چلتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں۔"

"اس پرے قبے ہی پر خدائی مار نظر آتی ہے۔" حید نے منہ بنا کر کہا۔

"ہو سکتا ہے کہ آج وہ مردے ہمیں بھی دکھائی دیں۔"

"کیا مطلب....؟" حید چونکہ کر بولا۔

"مردے.... نہیں سمجھے! یہم رے پیش مرداں یہ زیر دے مردے۔" فریدی اس کے

کانہ سے پہاڑھ رکھ کر جھکتا ہوا بولا۔

حید اسے حرمت زدہ نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم نے اکثر تواریخ کی کتابوں میں قدیم زمانے کے رومن یا یونانی سپاہیوں کی تصویریں

دیکھی ہوں گی ہو سکتا ہے کہ آج تم انہیں گوشت دپوت میں دیکھو۔"

"یعنی....؟"

"کیا تمہیں یاد نہیں۔" فریدی اپنی جیب میں سکار نٹولہ ہوا بولا۔ "کل رات کو وہ اپنے

سپاہیوں کا تذکرہ کر رہی تھی۔" حید کے ہونتوں پر ایک زہری مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میرا خیال ہے کہ آپ پر بھی جن آنے والے ہیں۔" حید نے کہا۔ "وہ اپنے ہوش میں

کب تھیں۔"

"تو میں کب کہتا ہوں کہ وہ ہوش میں تھی۔" فریدی نے خس کر کھا اور پھر اس نے وہ ساری

باتیں دھرا دیں، جو اس کے اور صولات مرزا کے درمیان ہوئی تھیں۔

"تو یوں کہئے تاکہ اس بار آمیٹ ہی بن جائے گا اپنا۔" حید نے اپنے پاپ میں تمباکو بھرتے

ہوئے کہا۔ "لیکن اس بیچارے کے کامیاب ہو گا جو صد ہا سال سے آپ کی یاد میں گریہ زادی کر رہا ہے۔"

"اے دیکھیں گے۔" فریدی بولا۔

"اچھا جناب اب مجھے تو بخش ہی دیجئے۔ میری بڑیاں کافی ملائم ہیں اور گوشت بھی کچھ ایسا

نہیں۔ اگر کہیں اس بازی یہ حولی ٹوٹ پڑی تو میرے کپڑے و حوبی عی کے یہاں پڑے رہ

جائیں گے۔"

"فکر مت کرو۔" فریدی سخیدگی سے بولا۔ "میں انہیں منگوا کر محتاجوں کو تقسیم کر ادؤں گا۔"

”اور میر اسرا اقرض بھی آپ ہی ادا کر دیں گے۔“

”چلو یہ سچ منکور۔“

”اچھا تو ایک استدعا اور ہے۔“

”فرمائی۔“ فریدی نے ہونٹ بھینچ کر کہا۔

”آج کی رات مجھے جی بھر کے سولینے دیجئے۔“

”مرنے سے پہلے سونے کی خواہش غور طلب ہے۔“

”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”بعض لوگ مرنے سے قبل عموماً ہو جلا کرتے ہیں۔ ایسی کوئی تشویش ناک بات نہیں۔ خیر دیکھا جائے گا۔“ حمید نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ فریدی بھی اٹھا۔

”ہمیں آج رات کو بہر حال جا گنا ہے۔“ اس نے کہا۔

”ہمیں نہیں مجھے کہئے۔“ حمید دانت پیس کر بولا۔ ”دیکھتا ہوں کہ مجھے دنیا کی کون سی طاقت سونے سے روکتی ہے۔“

”وہی طاقت جس نے کل رات کو مجھے تمہارے کرے میں آرام کر سی پر سلاادیا تھا۔“

”شاید آپ یہ سمجھتے ہیں کہ میں اس لڑکی سے ڈر گیا ہوں۔ لڑکی..... ہو نہ۔“

”نہیں بھی! تم تو یہ نہیں میرا دل خوش کر رہے تھے۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ ”خیر.... چلتے رہو۔ چلو حکیم ار سلانوس سے ملتے آئیں۔“

”کون وہی خطبی..... خیر چلتے۔ تھوڑی کوفت ہی دور ہو گی۔“

وہ دونوں ار سلانوس کے بتائے ہوئے چلتے پر روانہ ہو گئے۔

اور پھر جب قبے والوں نے ار سلانوس کے مکان کے سامنے دو اجنیوں کو دیکھا تو انہیں بڑی حیرت ہوئی۔ کیونکہ ان کی نظروں میں ار سلانوس ایسا آدمی نہیں تھا جس سے ماڑوں اور اپنڈیٹ قم کے لوگ دچپی لے سکیں گے۔

فریدی اور حمید ایک قدیم طرز کی عمارت کے سامنے کھڑے تھے جس میں ایک کافی بلند صدر دروازہ تھا اور دروازے کے اوپر بنے ہوئے سائبان میں ابا بیلوں کے گھونٹے لٹک رہے تھے جن میں شور چاتی ہوئی ابا بیلیں تھیں۔ شام کی ہلکی نیکتوں سیاہی میں یہ عمارت کچھ

پر اسرار سی معلوم ہو رہی تھی۔

تحوزی دیر بعد ایک آدمی باہر آکا، جو غالباً ارسلانوس کا نوکر تھا۔ اس کی آنکھیں کچھ چند حیائی ہوتی ہی لگ رہی تھی۔ حمید کو نہ جانے کیوں ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی چکاڈڑا جالے میں ہنکاوی گئی ہو۔

اس نے انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔

اندر گھستے ہی بابلیوں کے بیٹ کی بدبو نے ان کا دامغ خراب کر دیا۔ وہ تاکوں پر رومال رکھے دلیز سے گزر کر صحن میں نکل آئے۔ صحن کافی وسیع تھا اور صحن کے گرد بننے ہوئے چبوروں پر چاروں طرف بڑے بڑے کا بک رکھے ہوئے تھے جن سے کوتروں کی غفر غون غفر غونوں کی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کچھ کوڑا بھی لکھ اور پر ہی بیٹھے اور کچھ رہے تھے اور کچھ اپنے پر پہنچاتے ہوئے خانوں میں گھس رہے تھے۔ کچھ دیواروں پر تھے جنہیں ایک نوکر طرح طرح کی آوازیں نکال کر نیچے جلا رہا تھا۔

فریدی اور حمید کے ساتھ والے نوکر نے داہنی طرف کے دالان کی سمت اشارہ کیا جس کے اندر دھنڈی دھنڈی ہی روشنی پھیلی ہوتی تھی۔

ارسلانوس ان کے خیر مقدم کے لئے باہر نکل آیا تھا۔ اس نے بلکہ ہارخی رنگ کا نخنوں لکھ لبا کر تاہمکن رکھا تھا۔ باروں پر بڑے بالوں والی لوہیوں کی کھال کے جو تے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے بڑے بڑے بالوں کے ذمیر میں اپنے بیڑا گاڑ رکھے ہوں۔ اس وقت اس کے سر کے بالوں کا گلدستہ اور پاشے ہونے کے بجائے چاروں طرف پھیل گیا تھا۔

”آؤ یاد آؤ... میں تو سمجھتا تھا کہ تم نہیں آؤ گے۔“ حکیم ارسلانوس نے مسکرا کر کہا۔

”کیوں؟ یہ آپ کیوں سمجھتے تھے۔“ فریدی نے کہا۔

”بھی بات یہ ہے کہ میرے پاس دکھاوے کا تھا مجھ باث نہیں ہے۔“

”تو آپ مجھے اتنا باغ نظر سمجھتے ہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔

”نہیں نہیں... تھہارا باب پ بھی بڑا عالی ظرف تھا۔“ ارسلانوس نے کہا اور حمید کو گھوڑا نے گا۔

”یہ میرے عزیز ترین دوست مشر حمید ہیں۔“

”عزیز ترین! بھلام تم جیسے سنجیدہ آدمیوں کے ساتھ نالائقوں کا یہ کام۔“

حید نے بھنا کر فریدی کا شاند دبوچ لیا۔

وہ انہیں والان میں لے آیا۔ یہاں کئی بڑے بڑے پنگ پڑے ہوئے تھے جن میں سے کچھ پر کتابوں کے ذمیر نظر آ رہے تھے۔ ایک طرف پنگ کا ایک بڑا سامور کھا ہوا تھا۔
وہ دونوں ایک پنگ پر بیٹھ گئے اور ارسلانوس سامور کے قریب کھڑا ہو گیا۔
”میں تمہیں ولی کی چائے پلاؤں گا جیسی میں خود پیتا ہوں۔“ اس نے کہا۔
”کیسی چائے پیتے ہیں آپ؟“ حید نے بے تکلفانہ انداز میں پوچھا۔
”بغیر دودھ کی۔“

”اور چائے کی پتیوں کے بجائے تکھنو کا خیرہ استعمال کرتے ہیں۔“ حید نے طنزیہ انداز میں کہا۔
”دیکھا تم نے۔“ حکیم ارسلانوس نے فریدی سے پوچھا یہ بھی میں کہا۔
”تم حکیم صاحب کے رجتے سے واقف نہیں۔“ فریدی نے حید سے کہا ”کپنے الفاظ واپس لو۔“
اس نے حید کو اشارہ کیا اور حید کو الجھن ہونے لگی کہ آخر اس خبلی میں دلچسپی لینے کی کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

”میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔“ اس نے بے ولی سے کہا۔

”اخلاق کا تھا ضمیگی ہوتا چاہئے۔“ حکیم ارسلانوس نے سمجھی گی سے کہا۔
اور حید یہ محسوس کئے بغیر نہ رہ سکا کہ وہ اس وقت ایک انتہائی پراسرار آدمی سے ہم کلام ہے
کیونکہ اس نے اسے آج ہی ایسی حالت میں بھی دیکھا تھا جسے بعض سنجیدہ قسم کے بچے بھی
برداشت نہیں کر سکتے۔

”مگر کچھ لوگوں کو دوسروں کو دکھ پہنچا کر ہی لذت حاصل ہوتی ہے۔“ ارسلانوس نے پھر
کہا۔ ”انسانی زندگی کی منزل کے حصول میں لذت ضرور ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ساتھ ہمیں
یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ ہم دوسروں کو حصول لذت سے محروم تو نہیں کر رہے ہیں۔“

”آپ درست کہہ رہے ہیں۔“ فریدی جلدی سے بولا۔

”تمہیں قلنے سے دلچسپی ہے۔“

”بہت زیادہ۔“ فریدی نے جواب دیا۔ وہ بڑے غور سے اس کے چہرے کا جائزہ لے رہا تھا۔
”آب توریت کے متعلق کیا خیال ہے۔“ ارسلانوس نے کہا اور جنک کر چائے دافی میں سامور

سے گرم پانی ڈالنے لگا۔

”آب توریت....!“ فریدی نے پچھاہٹ کے ساتھ کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے کہ میں نے
فلسفہ اُنگریزی میں پڑھا ہے۔“

”ویقراطس کا نام سنائے۔“

”کیوں نہیں۔“

”وہ آب توریت کا لام سمجھا جاتا ہے۔“

”اوہ تو شاید آب توریت سے ایکچھہ رنیزم (Epicureanism) مراد ہے۔ حمیک ہے اس
کے متعلق سیرا وہی خیال ہے جو اور دل کا ہے۔“

”یعنی....!“

”یعنی کہ فلسفہ ہم جیسے آدمیوں کے بس کاروگ نہیں۔“ فریدی نے مسکرا کر کہا۔ وہ
драصل کسی فلسفیانہ بحث میں پہنچ کر وقت بر باد نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہاں ایک خاص مقصد
کے تحت آیا تھا۔

”ایسا نہ کہو.... ہم سب کسی نہ کسی فلسفے کے تحت زندگی بس رکرتے ہیں۔“ حکیم ارسلانوس
نے کہا۔

”ہو گا.... لیکن میں فلسفے کو حاصل حیات نہیں سمجھتا۔“

”کیوں....!“

”کیونکہ ان معاملات کے باوجود بھی فلسفہ....!“ فریدی کے چہرے پر مایوسی تھی۔ ”ہماری
معلومات تشنہ رہ جاتی ہیں۔“

”مثلاً....!“ حکیم ارسلانوس پیالیوں میں چائے انھیلہ ہوا بولا۔

”مثلاً ایک بہت معمولی سی بات۔“ فریدی نے لاپرواٹی سے کہا۔ ”یہ راج گز ہی میں
روئے والا کتا۔“

”لا جوں والا قوتہ....!“ حکیم ارسلانوس منہ سکوڑ کر بولا۔ ”فلسفے کو ان نقویات سے کوئی
سر دکار نہیں۔“

”لیکن یہ نقویات بھی اسی دنیا میں جنم لجتی ہیں۔“ فریدی نے سگار کیس اس کی طرف

بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اور اس کا متعلق بھی ہماری زندگی سے ہے۔“

حکیم ارسلانوس نے ایک سگار لے کر ہونٹوں میں دبایا۔ فریدی اور حمید نے چائے کی پیالیاں انٹھلیں، بغیر دودھ کی تلخ چائے تھی۔ اس میں شکر بھی خفیہ ہی سی ڈالی گئی تھی۔ حمید نے گھونٹ لیتے وقت نہ اسامنہ بنایا۔ بہر حال وہ اسے زہردار کرنی ہی تھی۔

”ہم آخر انہیں اس کائنات کے اجزاء کے کس خانے میں فٹ کریں گے۔“ فریدی چائے کی چکلی لے کر ارسلانوس کا سگار سلاکتا ہوا بولا۔ پہلے ہی کش پر اسے بری طرح کھانی آگئی۔

”لاحوال ولا قوت۔“ ارسلانوس نے کھانتے ہوئے نہ اسامنہ بنایا اور سگار کو صحن میں پھیک دیا۔

فریدی اپنا سگار سلاکا کر اس کی طرف جواب طلب نکالا ہوں سے دیکھنے لگا۔

”میں نے اپنی زندگی میں کئی بار وہ آواز سنی ہے لیکن میں نے کبھی اس کے متعلق سوچا ہی نہیں۔“ ارسلانوس نے کہا۔

”اب میں آپ کی دل سے قدر کرتا ہوں۔“ حمید نے اپنے سینے پر با تھوڑا کھکھ کر کہا۔ ”اور میں اس صورت میں آپ کی پوچا کر دیں گا اگر آپ فریدی صاحب کو بھی اپنا ہی جیسا بنا دیں۔“

”کیا مطلب....!“ ارسلانوس نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

”یہ کل رات کو اسی چکر میں میری جان گنو چکے ہوتے۔“

ارسلانوس فریدی کی طرف دیکھنے لگا۔

”یہ تھیک ہے امیں اسے سمجھنا چاہتا ہوں۔“ فریدی نے کہا۔

ارسلانوس کے ہونٹوں پر عجیب سی سکراہٹ چیل گئی۔

”ذ جانے کتنے اس حسرت میں مر گئے۔“ وہ آہتہ سے بولا۔

”میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا۔“ فریدی نے کہا۔

”اس چکر میں مت چڑو۔ اپنے بزرگوں سے سنتا آ رہا ہوں کہ وہ اکبر اعظم کے زمانے سے جی

باہے۔“

”اوہ....!“

”تم شاید اس گز ہمی کی تاریخ سے ناداقت ہو۔“

”قطعاً! میں اس کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔“

”یہ راج اکبر کی فوج کا ایک سردار تھا۔ اکبر نے اس کی خدمات کے صلے میں اس کو بہاں کی جاگیر عطا کر دی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ وہ بے پناہ دولت کا مالک تھا اور ملک کے کئی بڑے بڑے راجے اور مہاراجے بھی اتنے مال دار نہیں تھے۔ جسے ہم آج گزر گئے نام سے یاد کرتے ہیں، یہ ایک بہت بڑا اور ناقابل تسبیح قلعہ تھا۔ ایک رات رانا پر ٹاب سنگھ کی فوجوں نے ندی پار کر کے قلعے پر شخون مارا۔ شاید قلعہ دار پہلے دشمنوں سے مل گیا تھا۔ رانا کی فوج نے قلعے کی اینٹ سے اینٹ بچالوی اور ساری دولت لوٹ لی گئی۔ کہا جاتا ہے کہ تبھی سے اکثر برساتوں میں وہاں کتے کے روئے کی آواز سنائی دیتی ہے اور ندی میں باڑھ آجائی ہے۔ یہ بھی سننے میں آیا ہے کہ اب تک سیکروں آدمی اس کا راز جانتے کی کوشش میں جانوں سے ہاتھ دھوپکے ہیں۔“

”کیا اس کے راز سے کوئی اور چیز بھی داہستہ ہے۔“ فریدی نے پوچھا۔

حکیم ارسلانوں چوک کر اسے نٹولے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

”یہ مجھے معلوم نہیں۔“ اس نے توقف کے بعد کہا۔ ”لیکن میں تمہیں اس چکر میں نہ پڑنے کی رائے دوں گا۔“

”خیر چھوڑ یے۔“ فریدی نے اپنی پیالی ختم کر کے ایک طرف کھکاتے ہوئے کہا۔ ”ہاں ایک دلچسپ چیز میں نہ توٹ کی ہے۔“

”وہ کیا...!“

”تھی کہ اس قبیے کے بعض لوگ یونان پر نرمی طرح عاشق ہیں۔“

”یعنی...!“

”ایک تو آپ یونانی علوم پر عاشق ہیں۔ صولت مرزا کو یونانی ہتوں سے عشق ہے اور ان کی لڑکی۔ وہ تو خود ہی اب سے ہزار برس یا اس سے بھی زیادہ قبل کی تہذیب کی ایک نمائندہ بن جاتی ہے۔“

ارسلانوں بے تحاش ہنسنے لگا۔

”وہ لڑکی مکار ہے۔ اپنی دادی کی طرح صولت مرزا کی ماں بھی کچھ دنوں تک اسی ختم کے ذرا سے کھلتی رہی تھی۔ مخفی اس لئے کہ گھر والے اس سے خائف رہیں۔ وہ دوسروں پر چھائی رہے اور اب یہ چوبیا جیلہ دعی کمزراں کچھیلار ہے۔“

”مگر صولات مرزا تو کہتے ہیں کہ بچپن ہی سے اس کی یہ حالت ہے۔“

”میاں تم کیا چانو! اس نے سب کچھ اپنی دادی سے سیکھا ہے۔ مجھ سے پوچھو میں بھی اسی خاندان کا ایک فرد ہوں۔ میرے اور ان کے آبا اور جد ادا ایک ہی تھے۔“

”اوہ! اچھا صولات مرزا کے متعلق کیا خیال ہے۔“

”میں عموماً ایسے موقعوں پر اپنے خیالات ظاہر کرنے سے گریز کرتا ہوں۔“

”کیسے موقعوں پر۔“

”کوئی اور بات کرو۔“ حکیم ارسلانوس آکتا کر بولا۔ ”ندہ لوگ میرے لئے کوئی اچھی رائے رکھتے ہیں اور نہ میں ان کے لئے۔“

”لیا عقیلہ بھی نہیں! وہ تو کافی سمجھ دار عورت ہیں۔ وہ یقیناً آپ کی کافی عزت کرتی ہوں گی۔“

”اوہ سمجھا! شاید تم کوئی سمجھوتہ کرانے آئے ہو۔“ ارسلانوس مانتے پر مل ڈال کر بولا۔ ”یہ
نا ممکن ہے.... یہ ناممکن ہے۔“

”بھلا سمجھوتہ کیسا....!“ فریدی نے تحریر آمیز انداز میں کہا۔

”تم جانتے ہو عقیلہ میری کون ہے۔“

”نہیں۔“

”میری بہو ہے۔ ان لوگوں نے میرے بیٹے کو زہر دے کر مار ڈالا۔ انہوں نے ہمیں ہمیشہ
ذلت کی نظر دیں سے دیکھا ہے۔“

”زہر دے کے....!“

”ہاں عقیلہ بجائے خود ایک زہر ہے۔ اس کی حرکتوں کی بناء پر میرا اکلوتا بیٹا۔ بی کا شکار
ہو کر مر گیا۔“

”اوہ وہ بچے! کیا عقیلہ کی دوسری شادی ہو گئی۔“

”نہیں! وہ میرے لارکے کی اولاد ہیں۔“

وہ مردے

حکیم ارسلانوس سے واپسی کے وقت فریدی بہت خاموش تھا۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لڑکا جس کے کان میں پنگل بجارتا تھا اس کا پوتا تھا۔" حمید نے کہا۔ فریدی نے پر خیال انداز میں چلتے چلتے رک کر کہا۔ "ہاں اور اس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ صولت مرزا غیرہ نے ہی اسے بچوں اور بزرگوں کا فرق نہیں سمجھا۔"

"خیر اس سے کوئی بحث نہیں۔" حمید نے کہا۔ "مجھے تو وہ خبیث بھی بھوت ہی معلوم ہوتا ہے۔"

"آخر تمہارے سر پر بھوت کیوں سوار ہیں۔" فریدی نے جلا کر کہا اور سگار سکا کر پھر چل پڑا۔ حمید خاموش رہا۔ اس کی طبیعت کافی پیزار ہو چکی تھی۔ شاید اس کی زندگی میں پہلا موقع تھا کہ وہ خوبصورت لڑکیوں کا قرطب حاصل ہونے کے باوجود بھی اس پر نہ مژدگی چھائی ہوئی تھی۔ جب بھی اسے جیلے کا نشاہ ہوا چہرہ اور وحشت زده آنکھیں یاد آتیں تو اس کے سارے جسم میں سناہت دوڑ جاتی اور پھر جب وہ شکلیں کے متعلق کچھ سوچنے کی کوشش کرتا تو خود بخود اس کی طبیعت میں جلا ہٹ پیدا ہو جاتی۔ وہ بے چین تھا کہ کسی طرح یہاں سے نکل بھاگے۔ کبھی کبھی اسے خود پر بھی غصہ آتے گلتا۔ اس نے فریدی کے ساتھ بڑے بڑے سر کئے تھے اور وہ ان سے آلتا ہی تھا۔ مگر اس بار کی اتناہت بالکل مختلف تھی اور پھر جب وہ اسے اپنی بزدی پر معمول کرنے لگتا تو وہ یہ بھی سوچنے پر مجبور ہو جاتا کہ اس کے جسم سے کافی خون نکل چکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ کمزوری اسی بناء پر پیدا ہوئی ہو اور آہتہ دور ہو جائے۔ لیکن اس دل بہلاوے کے باوجود بھی وہ خبیث ارواح کا خوف اپنے ذہن سے نہیں نکال سکتا تھا۔

ای رات کو کھانے کی میز پر صولت مرزا کے خاندان والوں کے ساتھ حمید بھی موجود تھا۔ جیلے کے علاوہ اور سب لوگ گنگوٹی میں حصہ لے رہے تھے۔ اس نے کھانے کے دوران میں ہب دوبار صرف باورپی سے بات کی تھی۔ وہ بھی کھانے کی اچھائی یا برائی کے متعلق تھے تو گہرے ہوئے اسے کسی بات پر مخاطب کیا اور نہ اسی نے کسی سے کوئی بات کرنا ضروری سمجھا۔ گہرے ہوئے اس روئی سے لاپرواٹی کے بجائے کچھ دبادبا ساخوف ظاہر ہو رہا تھا۔

حمید نے اسے چھپلی رات کے بعد سے اب دیکھا تھا۔ وہ فریدی کے بیان کے مطابق صرف ایک چھپڑے مزان کی لڑکی معلوم ہو رہی تھی اور بس۔ اس وقت اس کے چھرے پر وہ رومان انگیز تاثرات نہیں تھے جو چھپلی رات کو دیکھائی دیتے تھے۔

شکلید فریدی کو تیار ہی تھی کہ اس نے اس کے کن کیسوں کے تراشے اکٹھائے ہیں اور انہیں

کس طرح ایک ابم کی محل میں ترتیب دیا ہے اور اب اس پر فریدی کے آٹو گراف لینا چاہتی ہے۔ صولت مرزا گنگوہ میں حصہ ضرور لے رہا تھا لیکن اس کا ذہن کسی اور طرف معلوم ہوتا تھا۔ اکثر وہ کوئی بات کہتے کہتے اپاٹک رک کر کچھ سوچنے لگتا۔

کھانا ختم کرنے کے بعد وہ دوسرے کمرے میں آبیٹھے۔ لیکن اب جمیلہ ان کے ساتھ نہیں تھی۔ تھوڑی دیر بعد کافی کا دور شروع ہو گیا۔ عقیلہ نے بچوں کو سونے کے لئے بھیج دیا تھا۔ اس لئے ایک اکتادینے والے ہنگامے سے نجات مل گئی تھی۔ اس دوران میں کہیں اتفاق سے صولت مرزا نے طفیل چیز دی۔ پھر کیا تھا۔ حمید نے جواب اتنے لطفی سنائے کہ تھوڑی دیر بعد وہ سب ہنسنے میں بھی کاملی محسوس کرنے لگے۔ خصوصاً تکلیف توہنستہ پہنچنے بے دم ہو گئی تھی۔

اور پھر جب فریدی نے یہ راج گڑھ کی بات چیزیں تو حمید کو بے تحاش غصہ آگیا۔ پھر انکے عقیلہ اور تکلیف کے لئے یہ موضوع بہت پرانا ہو چکا تھا اس لئے وہ جلد ہی انہیں اور حمید کے ذہن پر ایک خواب ہاک سی کاملی مسلط ہو گئی۔

فریدی صولت مرزا سے ان لوگوں کے متعلق گنگوہ کر رہا تھا جنہوں نے کہتے کی آواز کے متعلق معلومات بھی پہنچانے کے لئے جدوجہد کی تھی۔

”بھی تم نہیں جانتے۔“ صولت مرزا راز و ارادت انداز میں بولا۔ ”اس سے ایک دوسرے اخط بھی داہستہ ہے۔“

”کیا...؟“

”کسی پر اسرار خزانے کی ٹلاش۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”اور یہ خزانے والی بات بھی میرے ہی خاندان والوں کی زبانی باہر نکل پہنچی ہے۔“

”وہ کس طرح...!“ فریدی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”بودی بھی داستان ہے لیکن میں اختصار کے ساتھ بتانے کی کوشش کروں گا۔ ہم سے پہلے یہ جاکیر یہ راج ہای ایک سردار کے پاس تھی لیکن یہ آج کی بات نہیں۔ اکبر اعظم کے دور کی بات ہے۔“ اور پھر صولت مرزا نے یہ راج اور یہ راج گڑھی کے متعلق وہی کچھ بتایا جو ارسلانوس نے بتایا تھا۔

”پھر عہد جہاں گیری میں یہ جاکیر ہمارے خاندان میں ختل کر دی گئی۔ ہم نک ایسے بخوبی نہ“

پوچھو تو بہتر ہے۔"

"اگر کوئی خاص نقصان نہ ہو تو یہ بھی بتادیجھے۔" فریدی نے کہا۔
"بھی بات ذرا مصلحت نہیں ہے۔" صولت مرزا مسکرا کر بولا۔ "اور پھر تمہارے ساتھ ایک
ایسے صاحب موجود ہیں جو اطیفہ گو بھی ہیں۔ اگر انہوں نے"

"یقین سمجھے کہ میں برا شریف بچہ ہوں۔" حمید نے سنجیدگی سے کہا اور صولت مرزا ہنسنے لگا۔
"بھی بادشاہوں کی باتیں بھی بڑی عجیب ہو اکرتی تھیں۔ بات بات پر انعامات اور قتل کے
فرمان چلا کرتے تھے۔ مغل بادشاہوں میں خصوصیت سے جہاںگیر ان باتوں کے لئے بہت مشہور
ہے۔ قتل تو خیر اس نے کم ہی کرائے ہوں گے لیکن انعامات بہت تقسیم کئے ہیں اور وہ بھی ذرا ذرا
سی باتوں پر۔ میرے ایک مورث اعلیٰ جہاںگیری فوج میں ایک معمولی سپاہی تھے ایک بار بادشاہ دلی
سے آگرہ جا رہے تھے۔ تھوڑی فوج بھی ساتھ تھی۔ اس میں میرے مورث اعلیٰ بھی تھے۔ خیال
تحاکہ رات کو کہیں پر پڑا ضرور ہو گا۔ لیکن جہاںگیر عالم خوشی میں چلا ہی جا رہا تھا۔ لوگ دن کے
سفر سے بچک آگئے تھے کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کیا جائے اتنے میں کسی سردار نے کہا کہ
آج کم بہت الو بھی نہیں بولتے۔ یہ ایک بوڑھا سردار تھا اور اکثر جہاںگیر کی جوانی کے زمانے میں
اس کی خدمت میں رہ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ اگر جہاںگیر رات کے سفر میں الو کی آواز سن لیتا تو فوراً
ہی قیام کا حکم جاری کر دیتا تھا۔ ہمارے مورث اعلیٰ نے جب یہ بات سن تو وہ الو کی بوی بولنے پر
تیار ہو گئے۔ کام بڑا خطرناک تھا۔ یہ بات صرف اس سردار اور دوسرا ہیوں تک محدود تھی۔ قافلہ
آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ وہ حضرت آگے بڑھ گئے اور ایک درخت پر چڑھ کر الو کی طرح آوازیں
ٹکانا شروع کر دیں۔ الو کی آواز سنتے ہی جہاںگیر نے قیام کا حکم دے دیا۔ قصہ مختصر یہ کہ اسی رات
کو کسی نے بادشاہ تک خبر پہنچا دی کہ الو مصنوعی تھا۔ جہاںگیر نے میں تھا۔ اس پر اسے غصہ آنے کی
بجائے بھی آئی۔ مورث اعلیٰ صاحب طلب کئے گئے اس نے نفس کر انہیں بوم الدوలہ اور منہوس
الملک جیسے خطابات سے نوازا اور یہ راجح گھر کی جاگیر عطا کر دی۔

صولت مرزا خاموش ہو گیا اور ہنسنے لگا۔

"اس طرح میں اپنے خاندان کا آٹھواں الو ہوں۔" اس نے کہا اور مسکرا کر حمید کی طرف
دیکھنے لگا جو مصلحت نہیں تھی۔

”اور وہ خزانے کی بات۔“ فریدی نے پوچھا۔

”جاگیر کے ساتھ ہی ساتھ وہ قلعہ بھی ہاتھ آیا جو یہ راج گڑھی کے نام سے مشہور ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ اس وقت خراب حالات میں نہ رہا ہو گا۔ یہ راج ایک دولت مند آدمی تھا۔ اس نے ایک بڑا شاندار تخت بنوایا تھا جس کا تذکرہ اکثر پرانی کتابوں میں ملتا ہے اور وہ اس وقت تخت عقرب کے نام سے مشہور تھا۔ اس کی محل ایک بہت بڑے پچھوکی تھی اور وہ غالباً سونے کا تھا۔ بے شمار جواہرات اس میں جرے گئے تھے۔ اس نے وہ تخت اکبر اعظم کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے بنوایا تھا۔ راتا کے آدمی اس کی تاک میں تھے۔ ایک رات انہوں نے گڑھی پر ش خون مارا اور یہ راج کو قتل کر کے اس کی ساری دولت سمیٹ لے گئے۔ لیکن سنا جاتا ہے کہ وہ تخت ان کے ہاتھ نہیں لگا اور وہ اب بھی گڑھی ہی میں کہیں پوشیدہ ہے۔ خود میری خاندانی روایت بھی یہی ظاہر کرتی ہے۔ میرے اسلاف میں سے بھی بتیرے اس کی جستجو کر چکے ہیں۔ لیکن کسی کو کامیابی نہیں ہوئی اور خیر میں اسے بالکل ہی لغو خیال کرتا ہوں۔ اپنے خاندان میں میں ہی ایسا ہوں جس نے کبھی اس کی طرف دھیان ہی نہیں دیا۔“

فریدی خاموشی سے سن رہا تھا۔ صولت مرزا کے آخری جملے پر وہ خفیف سا مسکرا اور جیب سے سگار ٹھاکر کر اس کا کونہ توڑنے لگا اور حمید سوچ رہا تھا کہ حکیم ارسلانوں نے اس تخت کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ ممکن ہے کہ اسے اس کا علم ہی نہ ہو لیکن پھر بھی وہ.... صولت مرزا سے پوچھی ہی بیٹھا۔

”حکیم ارسلانوں صاحب بھی اس سے واقف ہی ہوں گے۔“

”ہو سکتا ہے۔“ صولت مرزا نے کہا۔ ”واقف تو قریب قریب سمجھی ہیں لیکن یقین بہت کم لوگ رکھتے ہیں۔“

”ٹھیک یاد آیا۔“ فریدی بولا۔ ”یہ حکیم صاحب واقعی بڑے دلچسپ آدمی ہیں۔ شام کو ہم لوگ ان کے گھر گئے تھے۔ لیکن وہ بہت قائدے سے ملے یہاں تو انہیں بالکل ہی مخبوط الحواس سمجھا تھا۔“

”بھلی آدمی ہیں۔ کبھی قاعدے کی پاتیں کرتے ہیں اور کبھی دماغ بالکل الٹ جاتا ہے۔“

صولت مرزا نے کہا۔

"کیا وہ آپ کے کوئی عزیز ہیں۔"

"ہاں بھی قریبی ہیں۔ عقیلہ کی شادی ان کے لڑکے کے ساتھ ہوئی تھی۔"

"تو کیا وہ بچہ ان کا پوتا ہے جسے وہ آج پر بیٹان کر رہے تھے۔"

"بس سمجھو! تم نے شاید ہی کسی دادا پوتے سے یا پوتے کو دادا سے اس قدر بے حکم دیکھا ہو۔ جاوید کو انہوں نے اس قدر سرچھار کھا ہے کہ خدا کی پناہ! سارے بچے انہیں کے بگاڑے ہوئے ہیں۔"

"بہر حال وہ ایک بہت ہی نہ اسرار آدمی ہیں۔" فریدی نے کہا اور حمید کو دہاں سے چلانے کا اشارہ کر کے مگار لے گا۔

حمد اللہ کراپنے کرے میں چلا آیا جہاں بچپنی رات وہ سویا تھا۔ اس نے شب خوابی کا باس پہنچا اور قدیل بجا کر لیٹ گیا۔ نیند نہی طرح مسلط تھی لیکن فریدی کے اس رویے نے اسے انجمن میں ڈال دیا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ آخر فریدی نے اسے دہاں سے ہٹا کیوں دیا۔ کیا کوئی ایسی اہم بات بھی ہو سکتی ہے جسے فریدی صرف اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتا ہے۔ کہیں وہ خزانہ تو نہیں جس کا تذکرہ صولت مرزا نے کیا تھا۔ مگر وہ فریدی کی طبیعت سے واقف تھا۔ فریدی جس نے دولت کی بکھری پر دواہ نہیں کی۔ کیا وہ ایک رواہی خزانے کے متعلق اسے اندر میرے میں رکھنا چاہتا ہے۔ حمید کا ذہن اس بات کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ پھر کیا بات ہو سکتی ہے۔ چند لمحے بعد اس کے خیالات کی رو جیلہ کی طرف بہک گئی اور اسے ایسا محسوس ہوا جیسے اس کے رو تکٹے کھڑے ہو رہے ہوں۔ لیکن پھر اسے اپنی بزدلی پر بُنسی آگئی۔ پاگل سکی... ہے تو عورت ہی اور وہ بھی گھر بلو ٹھم کی۔ عورت نہ ہو، ہٹر والی ہو سکتی ہے اور نہ چشے والی پھر آخر خوف کی وجہ، ہو سکتا ہے کہ اس پر جچ گئی سیریا ٹھم کا کوئی دورہ پڑتا ہو اور اگر نہ بھی پڑتا ہو تو اس کی ایسی تیسی، ایسی تیسی، ایسی تیسی... اور پھر اس کا ذہن "ایسی تیسی" کی گردان کرتا ہو اور نیند کی تاریک دلدل میں ڈوب گیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو وہ سمجھا کہ شاید کسی ڈراؤنے خواب نے اسے جگا دیا ہے لیکن پھر ایسا محسوس ہوا جیسے کوئی اُسے جگا رہا ہو۔

"شش! میں ہوں۔" اسے اندر میرے میں فریدی کی سرگوشی سنائی دی۔

"میباہت ہے۔" حمید اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

"آہستہ بولو۔ اس پر دو رہ پڑ گیا ہے۔" فریدی نے کہا۔

"لاحول ولا قوۃ....!" حمید دوبارہ لیٹتا ہوا بولا۔ اور شاید اب اس کے بھوت آہستہ آہستہ

آپ کی طرف خصل ہو رہے ہیں۔ ناخن کے عقل.... عق عق.... ل.... کے ناخن لجھتے۔

"عقل کے پچھے۔ چپ چاپ انھ جاؤ۔" فریدی نے اسے سمجھ کر انھالیا۔

"میں حق پھاڑ پھاڑ کر چینا شروع کر دوں گا۔" حمید بھنا کر بولا۔

"تمہارے حق سے آواز ہی نہ نکل پائے گی۔" فریدی نے اس کی گردن پکڑا۔

"ارے ارے۔" حمید پیچھے ہٹتا ہوا بولا۔

"چپ چاپ پیلے آؤ۔"

"خدا نے مجھے آدمی بنایا کہ سخت ظلم کیا ہے۔" حمید بھنا تا ہوا اچھل کی حلاش کرنے لگا۔

"جلدی کرو۔"

اور پھر وہ دونوں آہستہ سے برآمدے میں آگئے چاروں طرف تارکی اور سنائے کاراج تھا۔ حمید فریدی کے پیچھے پیچھے چلنے لگا۔ وہ جھاڑیوں اور مہندی کی باؤں کی آڑ لیتا ہوا عقبی پارک کی طرف بڑھ رہا تھا۔ پارک میں روشنی دکھائی دے رہی تھی۔ بعد میں حمید نے دیکھا کہ وہ ایک مشعل کی روشنی تھی۔ جیلے اپنے ہاتھوں میں مشعل انھائے اور بیان ہاتھ میں پر رکھے ہتوں کے درمیان کھڑی تھی۔ وہ دونوں ڈانٹا کے بت کے قرب و جوار میں اگی ہوئی مانی کی جھاڑیوں میں چھپ گئے۔ اس وقت جیلے بیچ اب سے ہزاروں برس پہلے کی عورت معلوم ہو رہی تھی۔ مخفون تک لپٹا ہوا ڈھیلا لبادہ اس وقت جدید طرز کا سلپنگ گاؤں نہیں معلوم ہوتا تھا۔ بال پشت پر بکھرے ہوئے تھے اور ایک سرکش سی لٹ چہرے کے سامنے لہرا رہی تھی اور مشعل کی سرخ روشنی میں اس کا چہرہ انگارے کی طرح مہک رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ چل کر ایک بت کے سامنے آئی اور اس کے چہرے کے برابر مشعل لے جا کر کہنے لگی۔

"تم کبھی نہیں بولو گے! کاش تمہارے پتھر میلے جسم کے اندر خون کا ایک قطرہ بھی ہوتا۔ میں کب سے تمہاری راہ دیکھ رہی ہوں۔ زور س کیا میں اسی طرح ترپ ترپ کر مر جاؤں۔ خبر اگر تم بھی چاہتے ہو تو اس جسم کو بھی مٹی کے کیڑے کھا جائیں گے اور ہڈیوں کا جگر بھی ایک دن

خاک ہو جائے گا۔ بولوز فورس کیا تمہیں وہ شام یاد نہیں جب ہم نیل کے شفاف پانی پر اپنے طلاقی بیڑے میں سیر کر رہے تھے اور ہم نے مغرب کی طرف سرخ دھوئیں کے باول دیکھے تھے اور تم نے کہا تھا کہ بادلوں کی دیوی قربانی چاہتی ہے۔ پھر ہم دوسرا دن سفر پر روانہ ہو گئے تھے۔ بادلوں کی دیوی کا مندر جو دودھ کی طرح شفاف اور اجلا ہے وہ ہمیشہ ایسا ہی رہے گا۔ تم نے سب کچھ بھلا دیا؟ تم نے اصل مرغ قربان کرتے وقت کہا تھا کہ تم زندگی بھر میرے ساتھ رہو گے۔ تم سب کچھ بھول گئے۔ زفورس تمہیں قسم ہے۔ اس قصر زمر دین کی جہاں سب سے بڑے معبدوں کے غلام رہتے ہیں۔ جہاں فضاؤں میں طلاقی اباٹلیں پرواز کرتی ہیں۔ سب سے بڑے معبدوں کے مرکب مقدس نیوالے کی قسم مجھے تو سب کچھ یاد ہے جیسے وہ کل ہی کی بات ہو۔ عود غیر کے دھوئیں کے پیچے لو دیتا ہوا چہرہ یاد ہے۔ بادلوں کی نیم تن دیوی کا مقدس چہرہ اس کی ملکوتی مسکراہٹ یاد ہے۔ مجھے سب کچھ یاد ہے۔ زفورس لیکن تم نے؟ کیا تمہارے فولادی بازو تحکم گئے۔ کیا تم مجھے رہائی نہیں دلاتے۔ میں جو سیاہ قام باغیوں کو اپنے ہاتھوں سے قتل کیا کرتی تھی میں جو بچپن میں سانپوں سے کھیلا کرتی تھی۔ میں جس نے ہراتلیں کی آنکھیں اپنی الگیوں سے نکال لی تھیں۔ ایک مخصوص فاختہ کی طرح بے بس ہوں۔“

وہ تھوڑی دیر سک خاموش رہی پھر اس نے اپنا چہرہ بائیں ہاتھ سے چھپا لیا۔

”میں اس کو ذبری کی چاکلیٹ کھلاوں گا۔“ حید نے آہستہ سے کہا۔

فریدی کچھ نہ بولا۔

”چھائیں تو چلا...!“ حید نے پھر کہا۔

”کہاں...!“ فریدی نے پوچھا۔

”ای کے پاس، اس سے چاکر کبوں گا۔ جان مکن۔ میں تمہارا زفورس ہوں۔ باپ کا نام پوچھے گی تو چورس بتاؤں گا پھر نہایت ادب سے ایک چاکلیٹ پیش کر کے یا تو تارک الدنیا ہو جاؤں گا یا اس کی بڑی بہن سے شادی کر لوں گا۔ اس طرح پچھے مفت ہاتھ آئیں گے۔“

”چپ رہو سور۔“ فریدی بھی ضبط کرتا ہوا بولا۔

”پہ نہیں کس الابالا کی قسم کھارہی ہے۔“ حید نے کہا۔ ”قسم ہے اس ولائی خرگوش کی

جو سال میں تمیں اٹھے دیتا ہے۔ یہ لڑکی کسی رات صولت مرزا کو قتل کر کے نکل جائے گی۔ اس کے سر پر فلم کچنی کا بجھوت سوار معلوم ہوتا ہے۔“
”بکومت....!“ فریدی جھنجھلا کر بولا۔

پھر انہوں نے جیلہ کی سکیوں کی آوازیں سنیں، وہ بچھوت پچھوت کر روری تھی۔
”بھتی مجھ سے اب برداشت نہیں ہوتی۔“ حمید نے کہا۔
”چپ رہو گدھے! صولت مرزا بھی یہیں کہیں چھا ہو گا۔“
”ارے یہ کیوں!“

فریدی نے کوئی جواب دیئے بغیر حمید کا شانہ دبادیا۔ اس کی نظریں سامنے اٹھ گئیں اور اگر فریدی نے دوسرا ہی لمحے میں اس کامنہ بھی نہ دبادیا ہوتا تو اس کی تیج سارے پارک میں اٹھی ہوتی۔ بت کے پچھے سے پانچ قد آور آدمی نکل آئے تھے۔ ان کے ہاتھوں میں لمبے لمبے نیزے اور خم کھائی ہوئی مستطیل ڈھالیں تھیں۔ لباس قدیم رومن یا یونانی سپاپیوں جیسا تھا۔ سروں پر آہنی خود تھے اور سب سے زیادہ حرمت انگیز چیز وہ روشنی تھی، جو ان کے چہروں پر پھیلی ہوئی تھی بلکہ زرد رنگ کی روشنی جس کا عکس ان کے سینوں پر پڑی ہوئی پچکدار زر ہوں پر پڑ رہا تھا۔ ان کے چہرے مشعل کی روشنی کے احاطے سے باہر تھے۔ دھنٹا جیلہ ان کی طرف چھپنی۔

”تم آگے۔ ہتاوز فورس کہاں ہے۔ آج تم مجھے لے کر ہی جاؤ گے۔ بولو جواب دو۔“

ان میں سے ایک کے ہونٹ پلتے رہے، جیسے وہ کوئی بات کہہ رہا ہو۔ لیکن آواز ندارد۔ پھر وہ ب تھیسا بھکے۔

جیلہ نے اس کا گربیان پکوک کر جھنجھوڑا۔ جس کے ہونٹ ہلتے تھے۔

”میں کچھ نہیں سن سکتی۔“ زور سے بولو۔ ”کیا تم بہرے ہو۔“

اس کے ہونٹ پھر ہلتے۔ لیکن آوازنہ نکلی۔ اس پار جیلہ نے اس کے منہ پر ایک تھپڑہ سید کر دیا جس کی آواز فریدی اور حمید نے صاف سنی۔ تھپڑہ کھانے کے باوجود بھی وہ بت بنا کھڑا رہا۔ اس کے چہرے پر تھکن تھکن آئی۔

حمید نبڑی طرح کانپ رہا تھا۔

”کیوں اب کیا خیال ہے بیٹا۔“ فریدی نے آہستہ سے کہا۔ ”نکلنے لگی جان۔“

جمید بدستور خوف کے ملے دانت کنکنا تارہ۔

چھپر کھانے والے نے اپنا نیزہ اور ڈھال زمین پر ڈال دیئے اور پھر دونوں ہاتھ آسان کی طرف اخواہیے۔ آنکھیں بند کر لیں اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کے چہرے پر بھی کیفیت طاری ہو گئی۔ جمید فریدی سے لپٹا جا رہا تھا۔ اور اس نے اسرار آدمی کی حالت غیر نظر آری تھی۔ یقین چار خاموش کھڑے تھے۔ دفلاؤ پھر اپنی اصلی حالت میں آگیا۔ اس بار اس کے ہونتوں پر مسکراہٹ تھی اور چہرہ بھی زندہ آدمیوں جیسا معلوم ہو رہا تھا۔

”قارہ...!“ اس کے بلٹے ہوئے ہونتوں سے آواز نکلی۔

”اے دادی نسل کی بیٹی۔“ اس نے زمین سے اپنا نیزہ اور ڈھال اخھاتے ہوئے کہا۔ ”تو اس قارے کے بغیر اس ٹلسما سے نکل نہیں سکتی۔“ اس کی آواز آدمیوں جیسی نہیں تھی۔ اس میں کچھ عجیب سا کھوکھلا پن موجود تھا۔ ویران ویران سی آواز۔

”میں نہیں جانتی تو کس قارے کا ذکر کر رہا ہے۔“

”وہ اسی عمارت میں کہیں موجود ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

دفلاؤ فریدی نے جمید کو پرے ہٹا دیا اور جہازیوں سے نکل کر ایک طرف ریختے لگا۔ جمید نے بھی اس کی تھیکی۔ اور ہر تھانے کیوں جیلے نے مشعل زمین پر گراوی اور اس پر ہمرا رکھ کر اسے بچھا دیا۔ پارک میں تاریکی چھائی۔ صرف ان پانچ آدمیوں کے چہرے روشن تھے۔ اچانک جمید کو بعض دفعہ تاؤں کی تصویریں یاد آئیں جن کے چہروں کے گرد روشنی کے ہاتے ہوتے ہیں۔ کیا یہ اسی حرم کی ملکوتی روشنی تھی۔ اس کا اول ایک بار پھر تمرا گیا۔

آسان پر پھر سیاہ بادل چھا گئے تھے۔ اندر ہمراپلے سے زیادہ گہرا ہو گیا تھا۔ مینڈ کوں کی ٹرٹراہٹ فضا میں انتشار برپا کئے ہوئے تھی۔ جہازیوں کی اوث سے ان نے اسرار آدمیوں کے چہرے صاف نظر آرہے تھے اور اب تو ان میں حرکت پیدا ہو گئی تھی۔ شاید وہ چل رہے تھے۔ فریدی اور جمید جہازیوں کی آڑ لیتے ہوئے ان کا تعاقب کرتے رہے۔ دفلاؤ فریدی شخصیں گیا۔ وہ اصلی کی طرف جا رہے تھے اور شاید جیلے بھی ان کے ہمراہ تھی۔ جمید نے فریدی کے ہاتھ میں وبا ہوا پانچی سی ڈور کا ایک لچھا دیکھا اور بھوٹکارہ گیا۔ آخر دہ کیا کرنے جا رہا تھا۔ اس کی سمجھی میں

نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ فریدی کو کس طرح روکے اس نے کئی بار کچھ کہتا چاہا لیکن منہ سے آواز نہ نکلی۔ بس وہ مشینی طور پر فریدی کے چیچے لگا ہوا تھا۔ اس کے اس فعل میں ارادے کو قطعی دخل نہیں تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کی ساری قوت کسی پر اسرار طریقے پر زائل ہو گئی ہو۔ بہر حال وہ فریدی کے ساتھ گھستا پھر رہا تھا۔

جیلہ ان آدمیوں سمیت اصلبل میں داخل ہو گئی۔ حمید کو یاد آیا کہ فریدی نے اس سلسلے میں اصلبل ہی کا تذکرہ کیا تھا۔ آخر اصلبل میں کیوں! فریدی کے خیال کے مطابق انہیں شاید کسی چیز کی تلاش تھی۔ اس وقت اس نے ان کی زبان سے ”فقارے“ کا نام بھی سنا تھا۔ اگر انہیں کسی فقارے کی تلاش تھی تو پھر بار بار اصلبل کا رخ کرنے کا یہ مطلب ہو سکتا ہے۔ حمید کے ذہن میں بیک وقت کئی سوال تھے۔ اگر وہ واقعی اب سے ہزاروں سال قبل کے مردے تھے تو ان کا یہاں کیا کام! ظاہر ہے کہ جیلہ صولت مرزا کی لڑکی نہیں تھی۔ اس حقیقت سے تو کسی کو انکار ہوئی نہیں سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ وہ ایک مخصوص حالت کے تحت خود کو اس کی قیدی سمجھنے لگے۔ یہ سب کچھ سکی لیکن کم از کم حمید کا ذہن اب اس بات کو قبول کرنے پر تیار نہیں تھا کہ وہ کسی ذہنی مرض میں جلا ہے۔ کسی ذہنی مرض میں جتنا ہو جانے کے بعد صرف مریض ہی کو عجیب و غریب ٹھکلیں نظر آلتی تھیں۔ دوسروں کو نہیں۔ پھر یہ کیا راز ہے۔ حمید اس قسم کی تھیوں میں الجھا ہوا فریدی کے ساتھ ریختا رہا۔ پھر فریدی اصلبل کے قریب پہنچ کر رک گیا اور تھوڑی دیر بعد وہ لوگ باہر نکل آئے۔ دھنٹا فریدی نے رسی والا ہاتھ بلند کر کے اسے گردش دی اور دوسرے لئے میں رسی اس کے ہاتھ سے نکل کر پر اسرار آدمیوں کی طرف جبھی اور پھر ان کے چہروں کی روشنی غائب ہو گئی۔ اوہر فریدی نے اپنے ہاتھ کو جھکا دیا اور اندر ہیرے میں کسی کے گرنے کی آواز آئی۔ ”خبردار اگر اپنی جگہ سے بٹے تو گوئی باردوں گا۔“ فریدی کی گرج وار آواز دور سک لہراتی چلی گئی۔

لیکن جواب میں کسی قسم کی آواز نہ سنائی دی۔ فریدی نے رسی کو کھینچنے کے لئے زور لگاتا شروع کر دیا۔ مگر یہ سود۔ آخر اسی نے بائیں ہاتھ سے مارچ نکالی.... اور روشنی ہوتے ہی اس کے منہ سے جہر تجھی نکل گئی۔ اصلبل کے قریب جیلہ تھا کھڑی تھی اور رسی کا دوسرا سرا اصلبل کے سامباں کے ستون کے گرد لپٹنا ہوا تھا۔ فریدی دیوانہ وار چاروں طرف دوڑ نے لگا۔

بیلے بے حس و حرمت مزدی سی۔

"نہ سہر جاؤ، نہ سہر جاؤ۔" قریب ہی کہیں صولت مرزا کی کپکپاتی ہوئی آواز سنائی دی۔

اس دوران میں فریدی نے پورے پارک کی دوڑ لگا دالی۔ لیکن ان پر اسرار شخصیتوں کا سراغ نہ ملا۔

"بڑے دلیر ہو.... بہت دلیر۔" صولت مرزا نے فریدی کے کاند سے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "مگر تم نے بہت نہ اکیا۔"

"یقیناً میں نے نہ اکیا کہ انہیں نکل جانے دیا۔"

"یہ بات نہیں۔ وہ ہرگز ہماری دنیا کے آدمی نہیں ہیں۔" صولت مرزا نے بھرا تی آواز میں کہا۔

"میں اس پر یقین کرنے کے لئے تیار نہیں۔"

"تم کیسی باتیں کر رہے ہو.... دیکھو.... تمہاری کند کہاں پھنسی ہے۔" صولت مرزا نے رسی کی طرف اشارہ کیا۔

"تو پھر گر اکون تھا۔"

"میں....!" صولت مرزا بولا۔ "ٹھوکر کھا کر گرا تھا۔"

جیلے ڈرامائی انداز میں آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔

"اب کیا ہو گا۔" حمید بولا۔

"اچھا ہی! آپ بھی بہک رہے ہیں۔" فریدی نے اس کی طرف مژکر کہا۔

جیلے ان کے قریب آ کر رک گئی۔

صولت مرزا نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ لیکن دوسرے ہی لمحے میں اس کے منہ پر ایک زور دار تھپڑ پڑا۔ فریدی نے جھپٹ کر جیلے کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔

"پاگل لڑکی۔" فریدی کے منہ سے اتنا ہی نکل سکا۔ کیونکہ جیلے اس کی ترفت سے نکل جانے کے لئے نہی طرح زور لگا رہی تھی۔

"اب تو بہتر لہی بے کہ میں اسے زہر دے دوں۔" صولت مرزا نے بھرا تی آواز میں

کہا۔

"اندر چلو۔" فریدی نے اسے عمارت کی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔
بہر اور وقت وہ اسے اس کے کمرے میں لائے۔ یہاں اسی جدوجہد میں اس کا ہاتھ میز پر جاپڑا
اور دو اسات ایک کتاب پر الٹ گئی۔ وہ ان پر نمای طرح خاہوتی رہی۔۔۔ نہ جانے کتنی مخلقات تا
ذالیں پھر تقریباً دو بیجے اسے نیند آگئی۔

بے تکے اشعار

"وسرے دن صبح جب فریدی اور حمید ناشت کرنے کے لئے اندر جا ہے تھے۔ انہوں نے
ایک کمرے میں جیلی کی آواز سنی جو کسی پر گھوڑی تھی۔
"میری میز پر سیاہی کس نے گرانی۔۔۔ صاف صاف بتاؤ، ورنہ کھال اور میز دوں گی۔" حرام
خور۔ مجھے جھوٹ سے نفرت ہے۔ جسچ بتاؤ، ورنہ تم سب کی شامت آجائے گی۔"
فریدی نے دروازے کو خفیض سادھکا دیا اور وہ کھل گیا۔ جیلی کے سامنے تین توکرائیں سر
چھکائے کھڑی تھیں وہ ان پر بر سر رہی تھی۔

"محترمہ یہ حماقت مجھ سے ہوئی ہے۔" فریدی نے آہستہ سے کہا۔
"آپ سے؟" وہ حیرت زدہ لہجے میں بولی۔ "آپ میرے کمرے میں۔"
"مجی ہاں! رات آپ کی طبیعت پھر خراب ہو گئی تھی۔"
جیلی خاموشی سے فریدی کو دیکھتی رہی پھر اس نے ہاتھ کے اشارے سے نوکر انہوں کو باہر
جانے کے لئے کہا۔
"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں کیا کروں۔" جیلی بولی۔
"کس سلسلے میں۔"

"عجیب بات ہے کہ میری طبیعت خراب ہوتی ہے اور مجھے اس کا احساس نہیں ہوتا۔ روز صبح
ایک نہ ایک نئی کھانی سنتی ہوں، میں کس طرح یقین کروں کہ مجھ پر دورہ پڑتا ہے۔ اب اجائی کا خیال
ہے کہ زیادہ پڑھنے کی وجہ سے ایسا ہوتا ہے۔ لہذا میں نے تقریباً ایک لاکھ کسی کتاب کو ہاتھ
نہیں لگایا۔ لیکن گمراہوں کے بیان کے مطابق مجھے اس حال میں بھی دوروں سے نجات نہیں

می۔ ادہ... خیر چلے، شاید آپ لوگ ناشتے کے لئے جا رہے تھے۔"

وہ ان کے ساتھ ہوئی۔ اس گفتگو کے دوران میں ایک بار بھی اس کے ہونتوں پر ہلکی سی مسکراہٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے یہ ساری باتیں ہوش میں کی تھیں۔ لیکن حمید کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ اب بھی اپنے ہوش میں نہ ہو اور کسی بھی لمحے میں پلٹ کر اس کی گردن دبوچ سکتی ہے۔ وہ ذرا ہمچنگ روم میں آئے۔ یہاں صولت مرزا عقیلہ اور شکلیلہ ان کا انتظار کر رہے تھے۔ ناشتے کے دوران میں زیادہ تر خاموشی رہی۔ شکلیلہ جب بھی زیادہ بولنے کی کوشش کرتی جیلیلہ اسے قہر آؤد نظر دیں سے گھوڑنے لگتی تھی۔ عقیلہ کی گھر بیلو ٹھرم کی باتوں پر اس کے ہونٹ سکڑ جاتے تھے۔ عقیلہ کے پچھوں سے توہ دہ نبڑی طرح بیزار معلوم ہوتی تھی۔ اس وقت وہ فریدی میں خاص طور پر دلچسپی لے رہی تھی۔

"ابا جانی کہتے ہیں کہ آپ کا مطالعہ بہت وسیع ہے۔" جیلیلہ نے فریدی سے کہا۔

"خاک بھی نہیں۔" فریدی مسکرا کر بولا۔ "البتہ فرمت کے اوقات میں تمہوا بہت پڑھنے کی کوشش ضرور کرتا ہوں۔"

"یو ہائی اس اساطیر کا مطالعہ کیا ہے آپ نے؟"

"شاید....! فریدی اپنی آنداز میں مسکریا۔

"مجھے یاد نہیں پڑ رہا ہے کہ اس دیوبھی کا کیا نام تھا۔ جس نے ناری سک کو خود پر سُتی کی بد دعا دی تھی۔"

"ڈاکتا...! فریدی نے سگار سلاکتے ہوئے کہا۔

"ڈاکتا... ڈاکتا..." جیلیلہ سر ہلا کر بولی۔ "میری یاد داشت روز بروز نکزور ہوتی جا رہی ہے۔"

حمد شکلیلہ کی طرف دیکھ رہا تھا جو سر جھکائے چپ چاپ ناشتہ کر رہی تھی۔

ناشتہ کے بعد لا کیاں انٹھ کر چلی گئیں اور وہ لوگ وہیں بیٹھے رہے۔

"اس وقت وہ قطعی ہوش میں ہیں۔" فریدی نے کہا۔

"ہاں! لیکن بھی اب میں عاجز آگیا ہوں۔ معلوم نہیں کب کیا ہو جائے۔ نہ جانتے وہ پانچوں کون ہیں۔" نواب صاحب تشویں کن لیٹھے میں بولے۔

"آپ رات کو ان کا کمرہ باہر سے مقفل کیوں نہیں کر دیا کرتے۔" فریدی نے کہا۔